اکتوبر تا دسمبر 2022ء

جلد اول/شمارہ دوم

کلاسیکی اور جدید ادب کا ترجمان

نقش فریادی

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر نصیر احمد اسد

مدیر منتظم: ڈاکٹر عبدالمنان چیمہ

مدیر: کومل شہزادی

کلاسیکی اور جدید ادب کا ترجمان

نقش فریادی

نقش فریادی ہے کس کی شوخیء تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا
غالب

مجلس ادارت

- ڈاکٹر نصیر احمد اسد
- ڈاکٹر عبد المنان چیمہ
- کومل شہزادی
- ڈاکٹر انصر جاوید گھمن

ناشر

پنجاب لٹریری فورم سیالکوٹ

سرورق پر مسعود سعد سلمان کی تصویر ہے۔

ASIAN RESEARCH INDEX

کلاسیکی اور جدید ادب کا ترجمان

نقش فریادی

اکتوبر تا دسمبر 2022ء

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر نصیر احمد اسد

مدیر منتظم: ڈاکٹر عبدالمنان چیمہ

مدیر: کومل شہزادی

نائب مدیر: فریدالدین مسعود برہانی

معاون مدیران:

ڈاکٹر انصر جاوید گھمن

ڈاکٹر طالب علی اعوان

ڈاکٹر محمد اکرم

پروفیسر محمد انوار الٰہی چودھری

قانونی مشیر: ڈاکٹر شکیل اختر ٹھاکر ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

جلد: اول شمارہ:2_____اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۲

برقی پتہ: Naqshfaryadi99@gmail.com

فون نمبر: 03316729376

پتا: فرسٹ فلور بزنس اینڈ کامرس سینٹر پیرس روڈ سیالکوٹ (پاکستان)

ARI ID: 1695781004291

Licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

مجلس مشاورت

ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ(ڈائریکٹر جنرل ادارہ فروغ قومی زبان پاکستان)
ڈاکٹر محمد یوسف خشک (چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان)
ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی(ماہر اقبالیات)
پروفیسر ڈاکٹر غلام عباس گوندل (ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ ہیومینیٹیز یونیورسٹی آف سرگودھا)
پروفیسر ڈاکٹر شفیق آصف(ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ ہیومینیٹیز یونیورسٹی آف میانوالی)
پروفیسر ڈاکٹر محمد افضال بٹ(ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ ہیومینیٹیز گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی سیالکوٹ)
پروفیسر ڈاکٹر سید عامر سہیل(صدر شعبہ اردو اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور)
پرفیسر ڈاکٹر فرحت نسیم علوی(صدر شعبہ علوم اسلامیہ،یونیورسٹی آف سرگودھا)
پروفیسر ڈاکٹر آصف اقبال یونیورسٹی آف ایجوکیشن فیصل آباد
پروفیسر ڈاکٹر عامر اقبال (یونیورسٹی آف سیالکوٹ)
پروفیسر ڈاکٹر طارق کلیم صدر پیپلز (ایم اے او کالج)
میاں محمد آصف اقبال(آئی جی ریٹائرڈ)
پروفیسر ڈاکٹر احمد عبداللہ قمر (گورنمنٹ گریجویٹ کالج کروڑ لیہ)
ڈاکٹر جاوید اقبال جاوید(اسسٹنٹ پروفیسر لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور)
پروفیسر ڈاکٹر عدنان احمد یونیورسٹی آف نارووال
پروفیسر ڈاکٹر محمد یار گوندل یونیورسٹی آف سرگودھا
پروفیسر ڈاکٹر علی قزلباش کمیلی(مدیر "پیغام آشنا" ایرانی قونصلیٹ اسلام آباد)
پروفیسر ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی، عین شمس یونیورسٹی، قاہرہ، مصر
پروفیسر ڈاکٹر احمد محفوظ، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، بھارت
پروفیسر ڈاکٹر ڈرمس بلگر، شعبہ اردو، استنبول یونیورسٹی، ترکی

ترتیب

اداریہ

مضامین

1۔ مولوی فیروزالدین ڈسکوی کی ادبی خدمات — ڈاکٹر نصیر احمد اسد

2۔ مابعد جدید کے نظریہ کا اصل مقولہ — احمد سہیل

3۔ اُردو میں افسانوی تنقید کا نیا پیراڈائم اور آصف فرخی "عالمِ ایجاد" کی روشنی میں — ایم۔ خالد فیاض

4۔ اردو شاعری میں مغربی تہذیب کا تذکرہ — ڈاکٹر عبدالمنان چیمہ

5۔ ناول "دھنی بخش کے بیٹے" میں خیر و شر کا تصور — کومل شہزادی

6۔ ناول "جہنم جاگتا رہتا ہے": تحقیقی و تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر محفوظ احمد ثاقب

7۔ نسیم حجازی۔۔۔ تحریکِ پاکستان کا عملی کردار — عذرا پروین

8- ثمینہ سید کی افسانہ نگاری — منیر عباس سپرا

تبصرے

1۔ "گونجتی سرگوشیاں" کی گونج — نعمان نذیر

2۔ ڈاکٹر سکندر حیات میکن کی تحقیقی و تنقیدی کتاب "ادبی ستارے پر ایک اجمالی نظر۔۔۔ وجیہہ ضمیر

3۔ حکیم محمد صادق سیالکوٹیؒ کی اردو سیرت ''جمالِ مصطفیٰ'' کا تعارف و جائزہ — ڈاکٹر انصر جاوید گھمن

افسانچے

1۔ آن لائن لیکچر — شاہد اشرف

2۔ ڈیجیٹل بچے — محمد علی صدیقی

3۔ طبقاتی نظام میں ہوا کی تقسیم — محمد جمیل اختر

4۔ تیراک — وجیہہ ضمیر

افسانے

1۔ چوتھا دروازہ — خالد فتح محمد

2۔ پسلی — ڈاکٹر مجاہد عباس

3۔ آزاد	سکندر عباسی
4۔ کوزہ گر۔۔۔اور شہر اوہام	عدنان ظفر
5۔ زرد آدمی کی سیاہ کہانی	شاکر انور

غزلیں

1۔ غزل	فرحت شکور (پاکپتن)
2۔ غزل	اجمل اعجاز
3۔ غزل	الیاس بابر اعوان، نمل یونیورسٹی اسلام آباد
4۔ غزل	ثمینہ سید
5۔ غزل	قاضی اعجاز محور
6۔ غزل	انعام کبیر، لیکچرار اردو
7۔ غزل	محمد ایوب صابر
8۔ غزل	رانا عامر لیاقت، اسسٹنٹ کمشنر گجرات
9۔ غزل	مبشر سعید، رجسٹرار یونیورسٹی آف ساہیوال
10۔ غزل	ڈاکٹر انور علی انور
11۔ غزل	ناصر ملک
12۔ غزل	ڈاکٹر الیاس عاجز
13۔ غزل	عنبرین خان

نظمیں

1۔ نظم (مشینیں)	نوید ملک
2۔ مجھے کتنی سہولت ہے	ازہر ندیم
3۔ نعمان سلیم کی انگریزی نظم کا ترجمہ	عنبرین خان

اداریہ

سیالکوٹ کی تہذیب قدامت کے لحاظ سے پانچ ہزار سال سے بھی پہلے کے آثار ظاہر کرتی ہے۔راجہ شل نے اس تہذیب کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔اس شہر کی تہذیبی روایات اور علمی آثار "مہابھارت" میں بدرجہ اُتم موجود ہیں۔سیالکوٹ کی مٹی بڑی زرخیز اور مردم خیز ہے۔سرزمین سیالکوٹ نے علم وادب وفنون لطیفہ کے میدانوں میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔سیالکوٹ کی علمی وادبی اہمیت مسلمہ ہے۔ہر دور میں خواہ وہ ہندو راج ہو، مغلیہ راج ہو یا انگریز راج سیالکوٹ نے ہر دور میں علمی وادبی مرکز کے حوالے سے اپنی شناخت قائم رکھی ہے۔یہاں سے بہت سی نامور روحانی اور علمی وادبی شخصیات نے جنم لیا ہے اور بعض نے یہاں کی روحانی اور علمی وادبی شخصیات سے فیض حاصل کیا ہے۔۷۰۰ قبل مسیح سے ۶۰۰ قبل مسیح تک یہ اتنا عظیم تعلیمی مرکز تھا۔کہ بنارس کے شہزادے حصول علم کے لیے یہاں آتے تھے۔

اکیسویں صدی عیسویں میں بھی شہر اقبال اپنی تہذیبی و ادبی روایات کی بازیافت کے لیے خاصا سرگرم عمل ہے۔ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، مولانا فیروزالدین، اقبال، فیض، مولانا ظفر علی خاں، ہاشم شاہ، حضرت رائج سیالکوٹی، دلشاد، منشی میراں بخش جلوہ، محمد الدین فوق، اثر صہبائی، سلیم واحد سلیم، بدری ناتھ سدرشن، جوگندر پال، غلام الثقلین نقوی، رجندر سنگھ بیدی، عبدالحمید عرفانی، سرمد صہبائی، خالد نظیر صوفی، ڈاکٹر جاوید اقبال، ساغر جعفری، مولوی ابراہیم میر، آسی ضیائی رامپوری، طفیل ہوشیارپوری، اے ڈی اظہر، حفیظ صدیقی، صابر ظفر، اصغر سودائی اور جابر علی سید دنیائے شعروادب کے اہم ستارے ہیں۔جن کا تعلق سیالکوٹ کی دھرتی کے ساتھ تادم حیات رہا۔موجودہ دور میں بھی خطہ سیالکوٹ علمی وادبی میدان میں مضافاتی دائرے سے نکل کر قومی وبین الاقوامی ادبی دھارے میں شامل ہونے کے لیے پرتول رہا ہے۔پنجاب لٹریری فورم سیالکوٹ اسی سلسلے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔اس ادبی تحریک کا ثمر اس خطے کی ادبی سرگرمیوں کی نشاۃ ثانیہ کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔سہ ماہی "نقش فریادی" اسی نشاۃ ثانیہ کی ایک کڑی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ رسائل وجرائد، علمی وادبی روایات کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔یہ دانش وفنون کی ترویج کا بھی موثر ذریعہ بن کر سامنے آتے ہیں۔معروف محقق ونقاد، ماہر لسانیات اور استاد محققین پروفیسر ڈاکٹر غلام عباس گوندل (ڈین آرٹس اینڈ ہیومینیٹیز یونیورسٹی آف سرگودھا) کی نگرانی میں "نقش فریادی" کی شکل میں ادب کے فروغ کے کام کا آغاز کیا جارہا ہے۔قارئین کے لیے یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ ملک کے نامور محققین وناقدین اور قومی وادبی اداروں کے سربراہان "نقش فریادی" کی مجلس مشاورت میں شامل کئے گئے ہیں۔سہ ماہی "نقش فریادی" کا دوسرا شمارہ قارئین ادب کے ذوق مطالعہ کی نظر اس اُمید کے ساتھ کہ یہ ادبی اقدار کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

مدیر اعلیٰ ڈاکٹر نصیر احمد اسد

مولوی فیروز الدین ڈسکوِی کی ادبی خدمات

ڈاکٹر نصیر احمد اسد

مولوی فیروز الدین ڈسکوی کی شاعری کے ساتھ ساتھ نثری ادب میں بھی نمایاں خدمات ہیں۔ نثر میں وہ بہترین سوانح نگاروں میں شامل ہیں۔ سوانح نگاری کی صنف باقی اصنافِ نثر کے مقابلے میں اپنے ماحول اور اس کے رجحانات کی عکاسی زیادہ بہتر انداز میں کرتی ہے۔ اُردو میں سوانح نگاری کا آغاز عہد سر سید سے ہوتا ہے۔ حالی کی ''حیاتِ جاوید''، ''یادگارِ غالب'' شبلی کی ''سیرت النبیؐ'' اور ''سیرت النعمان'' میں سوانح نگاری کے قائم کردہ معیار کی پیروی ایک عرصے تک کی جاتی رہی۔ سر سید کا دور مذہبی مناظرے اور بحث و مباحثے کا دور ہے لہٰذا اس دور کی سوانح عمریاں اپنے عہد کی عکاس ہیں۔ اس دور کے مشہور سوانح نگاروں میں: مرزا حیرت دہلوی، احمد حسن خان، عبد الحلیم شرر، منشی محمد الدین فوق، مولوی احمد دین، احمد حسین الہٰ آبادی، مولوی ذکاء اللہ، سر اجد ین احمد ،نذیر احمد، قاضی سلیمان، عبد الرزاق کانپوری اور مولوی فیروز الدین ڈسکوی اہم ہیں۔

فضائل اسلام فی ذکر خیر الانام المعروف سیرت النبیؐ یا تاریخ نبویؐ مولوی فیروز الدین ڈسکوی کی پہلی باقاعدہ نثری تالیف ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مفید عام پریس لاہور سے ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا۔ اور ''نماز اور اس کی حقیقت'' مولوی صاحب موصوف کی دوسری نثری تالیف ہے۔ یہ کتاب منشی فیض علی نے پنجاب پریس سیالکوٹ سے ۱۸۹۰ء میں شائع کی۔ ''تفسیر فیروزی پارہ اول'' مولوی صاحب کی تیسری تصنیف ہے۔ یہ کتاب ۱۸۹۰ء میں سیالکوٹ مفید عام پریس سے شائع ہوئی۔ ''تکذیب وید'' مولوی صاحب کی چوتھی تصنیف ۱۸۹۰ء میں پنجاب پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''تصدیق الا لہام'' مولوی صاحب موصوف کی مناظراتی تصنیف ہے۔ جو ۱۸۹۰ء میں پنجاب پریس سیالکوٹ سے طبع ہوئی۔ ''دعائے گنج العرش و تعویز گنج العرش'' مولوی فیروز کی چھٹی نثری کتاب ہے جو ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی۔ ''فضائل اسلام فی ذکر خیر الانام المعروف سیرت النبیؐ'' پنجاب پریس سیالکوٹ سے ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی۔ ''عشرہ کاملہ'' مولوی صاحب موصوف کی آٹھویں نثری تصنیف ہے۔ یہ کتاب ۱۸۹۱ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔

''سورت رحمن کی نادر تفسیر'' مولوی صاحب کی دسویں تصنیف ہے۔ جو ۱۸۹۲ء میں مطبع مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''مسلمانوں کا مسیح اور عیسائیوں کا'' مولوی صاحب کی ایک مناظراتی تصنیف ہے۔ جو سیالکوٹ مفید عام پریس سے ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی۔ ''اسم اعظم'' مولانا موصوف کی بارہویں کتاب ہے جس میں پیرانِ پیر شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی سوانح عمری، تعلیمات اور کرامات کا بیان ہے۔ یہ کتاب مفید عام پریس سیالکوٹ سے ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی۔ ''طریقت الحقیقت'' مولوی صاحب کی تیرھویں کتاب ہے جو ۱۸۹۲ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''رسالہ ہدایت القاری'' تصنیف ۱۸۹۲ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔

''روزہ اور اس کی حقیقت'' مولوی صاحب کی پندرھویں نثری تصنیف ہے جو مفید عام پریس سیالکوٹ سے ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی۔ ''الوہیت مسیح اور تثلیث کا رد'' مولوی صاحب کی سولہویں کتاب ہے جو مفید عام پریس سے شائع ہوئی۔ ان کی سترھویں کتاب ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی۔ ''عصمت النبی عن الشرک الجلسی'' مولوی فیروز کی اٹھارویں تصنیف ہے جو ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی۔ ''تقدیس الرسول عن طعن الجہول'' اُنیسویں کتاب ہے جو مفید عام پریس سے شائع ہوئی۔ ''برآت الرسولؐ العرب عن طعن نکاح زینبؓ المعروف بہ دفع طن نکاح زینبؓ'' بیسویں کتاب ہے جو ۱۹۹۳ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''اسرار التنزیل'' مقالہ مولوی صاحب موصوف کا مقالہ ہے جسے انجمن حمایت اسلام لاہور نے ۱۸۹۶ء میں شائع کیا۔ ''ضمیمہ آریہ مت کی عکسی تصویر'' مولوی فیروز کی تئیسویں تصنیف ہے۔ جو ۱۸۹۸ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''پچاس مذہبی سوالات کے جواب'' چوبیسویں کتاب ہے۔ جو ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی ''نماز کی خوبیاں'' پچیسویں کتاب ہے۔ جو مفید عام پریس سیالکوٹ سے ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی۔ ''نماز حضوری'' مولوی صاحب موصوف کی چھبیسویں کتاب ہے جو ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی۔ ''سورہ فاتحہ کی تفسیر'' مولوی صاحب کی ستائیسویں کتاب ہے جو مفید عام پریس سیالکوٹ سے ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی۔ ''پیارے نبیؐ کے پیارے حالات جلد اول'' مولوی فیروز کی اٹھائیسویں کتاب ہے جو مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔

''مجموعہ خطبہ فیروزی'' مولوی صاحب کی تیسویں تصنیف ہے جو ۱۹۰۱ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''اسلام اور اس کی حقیقت'' مولوی صاحب کی اکتیسویں تصنیف ہے جو ۱۹۰۱ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''اسلام کی پہلی کتاب'' جو ۱۹۰۲ء کو مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''اسلام کی دوسری کتاب'' تینتیسویں کتاب ہے۔ مولوی صاحب کی چونتیسویں کتاب ''اسلام کی تیسری کتاب'' ہے جو ۱۹۰۴ء کو مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''اسلام کی پانچویں کتاب'' مولوی صاحب کی چھتیسویں کتاب ہے جو مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''انسان اور اس کی تقدیر'' مولوی صاحب کی انتالیسویں کتاب ہے جو ۱۹۰۲ء کو مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت'' مولوی فیروز الدین کی چالیسویں کتاب ہے جو مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی ہے۔

''تفسیر فیروزی سورہ عم'' مولوی صاحب کی اکتالیسویں کتاب ہے جو ۱۹۰۲ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''اسلام اور عیسائیت کا قطعی فیصلہ'' مولوی صاحب کی بیالیسویں کتاب ہے۔ جو سیالکوٹ مفید عام پریس سے ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ ''قرآن شریف کی قسمیں اور ان کی فلاسفی'' مولوی صاحب کی تینتالیسویں کتاب ہے۔ جو ۱۹۰۴ء میں مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''تفسیر فیروزی تیسواں پارہ''، مولوی فیروز کی سنتالیسویں کتاب ہے۔ ''تفسیر فیروزی پارہ دوم'' مولوی صاحب کی اڑتالیسویں کتاب ہے جو مفید عام پریس سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ مولوی صاحب کی انچالیسویں کتاب ہے۔ جو مفید عام پریس

سیالکوٹ سے شائع ہوئی۔ ''تفسیر فیروزی پارہ چہارم'' مولوی صاحب کی تصنیف ہے جو پنجاب پریس سیالکوٹ سے ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔

''گلزار یوسفی'' مولوی صاحب کی ۵۲ ویں کتاب ہے۔ جو لاہور سے ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔ ''پیارے نبی کے پیارے حالات (جلد سوم)'' مولوی صاحب کی ۵۳ ویں تصنیف ہے۔ جو مفید عام پریس سیالکوٹ سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ ''مختصر قانونی اصطلاحات'' مولوی صاحب کی ۵۴ ویں کتاب ہے جس کا پہلا ایڈیشن مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ مولوی فیروز الدین ڈسکوی کی لغات اور قواعد کے حوالے سے شہرہ آفاق کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن کا مولوی فیروز کی اردو ادب کی نثری خدمات کے حصے میں ذکر کرنا ضروری نہیں ہے۔

اُنیسویں صدی کو، نصف آخر کے حوالے سے استدلال اور مناظرے کی صدی کہا جا سکتا ہے اور ہر قسم کے ادب کی تخلیق انھی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھ کر کی جا رہی تھی۔ سوانح نگاری کو بھی انھی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا گیا۔ سر سید کی ''خطباتِ احمدیہ'' کے بعد اردو میں رسول کریمؐ کی سوانح عمریاں لکھنے کا رواج شروع ہو گیا۔ اس زمانے اور اس سے قبل لکھنے والوں میں ایک قابل ذکر نام مولوی فیروز الدین کا بھی ہے۔ ذیل میں مولوی صاحب موصوف کی تین سوانحی تصانیف، ''پیارے نبیؐ کے پیارے حالات''، ''فضائل اسلام فی ذکر خیر الانام'' المعروف ''بہ سیرت النبیؐ'' یا ''پیارے نبیؐ کے پیارے حالات''، سیرت پر لکھی ہوئی کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مقدس انبیاء کے حالات بابرکات، تیسرے میں حضورؐ کے اخلاق وعادات، چوتھے میں تورات وانجیل کی بشارات، پانچویں میں آنحضرتؐ کے معجزات چھٹے میں حضورؐ کی مختصر تعلیمات اور ساتویں باب میں حضورؐ کی زندگی کے مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ پہلے باب میں مولوی صاحب موصوف نے ان بائیس انبیا کے اجمالی حالات بیان کیے ہیں۔ جن کا ذکر قرآن سے ملتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے انبیاء کے حالات کے وہی پہلو اُجاگر کیے ہیں جن کا تعلق ثبوت نبوت، ثبوت قرآن یا کسی اور صداقت سے ہے۔ مثال کے طور پر حضرت صالحؑ کے حالات لکھنے کے بعد انھوں نے آخر پر لکھا ہے: ضرت رسول کریمؐ کے ساتھ اس قصہ کا تعلق، بہ حیثیت اثبات نبوت کے یہ ہے کہ جس طرح یہ قوم اپنے پیغمبر کی تکذیب کی وجہ سے تباہ اور ہلاک ہوئی۔ اسی طرح مکہ کے کفار اور اسلام کے مخالف ہلاک ہوں گے۔ مولوی موصوف نے صرف انبیا کے قصے ہی بیان نہیں کیے، بلکہ واقعات سے نتائج اخذ کر کے قارئین کو اخلاقی سبق بھی دیا ہے:

جب کوئی خلیفہ کسی خاص خدمت کے انجام دینے کے لیے خدا کی طرف سے مامور ہوا۔ شیطان اور شیطانی لشکر بھی پوری قوت اور پورے زور کے ساتھ مقابلے کے لیے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ان کی مخالفت میں یہ سر ہوتا ہے کہ اہلِ بصیرت کو معلوم ہو جائے کہ وہ کسی زمینی بھروسے سے کامیاب نہیں ہوتے بلکہ صرف تائید الہیٰ اور آسمانی ہتھیاروں سے۔ پیارے نبیؐ کے پیارے حالات کے سلسلے میں مولوی صاحب نے بائبل کی خاص بشارات بھی درج کی ہیں۔ آپؐ کے معجزات نشانات، خوراق، عادات اور پیش گوئیاں درج

کی ہیں۔ مولوی صاحب نے وہ پیش گوئیاں درج کی ہیں جن کی صداقت کی گواہی متعصب سے متعصب آدمی بھی دینے پر مجبور ہے۔ واقعات نبویؐ کے بیان کے بعد حضورؐ کے اخلاق و عادات خصوصاً عقل و کمال، حسن و جمال، فصاحت و بلاغت، سخاوت، شجاعت، حلم و عفو، رحم و تحمل، سادہ اور بے تکلف زندگی کی عملی م-ثالیں بیان کی ہیں: ظرافت کے سلسلے میں ایک مثال ملاحظہ فرمائیں: ایک اعرابی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ کہنا چاہا۔ اس وقت آپؐ اُداس تھے۔ صحابہؓ نے اسے منع کیا۔ اس نے کہا قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے آپؐ کو نبی برحق بنا کے بھیجا۔ میں آپؐ کو بے ہنسائے نہیں چھوڑوں گا۔ پھر یوں بولا کہ یارسول اللہ۔ ہم نے سنا ہے کہ دجال لوگوں کے لیے ثرید لائے گا۔ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں کیا آپ مجھے حکم دیتے ہیں کہ میں اس ثرید سے محروم رہوں اور نہ مانگوں؟ یہاں تک کہ لاغری سے مر جائوں یا یہ حکم دیتے ہیں کہ اس کو ثرید پر ہتے لگادوں اور جب خوب سیر ہو جائوں تو اللہ پر ایمان لائوں اور اس کا منکر ہو جائوں؟ یہ سن کر آپؐ کی کچلیاں کھل گئیں اور بہت زیادہ ہنسے، اور فرمایا کہ جس چیز سے اللہ تعالیٰ مومنوں کو غنی کر دے گا۔ اس سے تجھ کو بھی اس کی پروانہ رہے گی۔ آخر پر آپؐ کی بعثت اور زندگی کے مقاصد بیان کیے گئے ہیں جن میں گہری حکمت ہے۔ اس سے الہیات کے بہت سے اصول حل ہو جاتے ہیں۔ ان مقاصد پر غور کرنے سے آنحضرتؐ کی نبوت کی صداقت میں کوئی شک نہیں رہتا۔ آنحضرتؐ کا دنیا میں عملی توحید قائم کرنا، اخلاق حسنہ کی تکمیل، حق کی ظاہری اور باطنی فتح، بطلان کی ہلاکت، احکام الٰہی میں سطوت و جبروت، عقبیٰ کی جزا و سزا اور قیامت کا آنحضرتؐ کے واقعات عصری سے قطعی ثبوت اور حضورؐ کی عملی زندگی سے آپؐ کی نبوت کا ثبوت سب کچھ بین طور پر بیان کیا گیا ہے۔

''پیارے نبیؐ کے پیارے حالات'' میں تذکرہ نگاری، سیرت نگاری اور تاریخ نگاری سے مدد لی گئی ہے۔ اختصار اور جمال اس کی نمایاں خصوصیات میں سے ہیں۔ تمام تاریخی واقعات نبویؐ جن کو آپؐ کی زندگی میں زبردست اہمیت حاصل ہے۔ نہایت اختصار سے بیان کر دیے گئے ہیں۔ ''پیارے نبیؐ کے پیارے حالات'' میں لمبی چوڑی عبارت آرائی نہیں کی گئی بلکہ سادہ اور صاف طور پر حضورؐ کے حالات بیان کر دیے گئے ہیں۔ مولوی موصوف نے سادگی اور اختصار کو حد درجہ ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ ان کا اسلوب تحریر سلیس واضح اور منطقی ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے اور خطِ مستقیم میں آگے بڑھتے ہیں۔ اور مطلب ادا کرنے میں کسی قسم کی دشواری کا احساس نہیں دلاتے۔

پادری عماد الدین پانی پتی نے ۱۸۷۲ء میں ''تواریخ محمدیؐ'' امرت سر سے شائع کی۔ پادری نے اس کتاب میں نبی اکرم کی ذات اقدس پر نہایت رکیک الزامات لگائے۔ اگرچہ علمائے اسلام نے اپنے اپنے انداز میں پادری کی ہرزہ گوئی کا جواب دیا۔ مولانا حالی کی ''تواریخ محمدیؐ'' پر منصفانہ رائے اور مولوی چراغ علی کی تعلیمات اس سلسلے میں عمدہ جواب ہیں لیکن مولوی موصوف کی ''فضائل اسلام فی ذکر خیر الانام المعروف بہ سیرت النبیؐ''، ''کتاب تواریخ محمدیؐ'' کا دندانِ شکن جواب ہے۔ ''فضائل اسلام فی ذکر خیر الانام'' میں حضورؐ کا قریباً کل حال ترتیب وار، مفصل، معتبر علمائے نصاریٰ کے اقوال انتخاب کر کے مرتب کیا گیا ہے اور جو جو

اعتراضات عیسائی آنحضرتؐ کی سیرت پر کرتے ہیں ان کا جواب انھیں کے علما سے لایا گیا ہے۔''فضائل اسلام فی ذکر خیر الانام'' کی خاص خوبی یہ ہے کہ ساری کتاب مستند مخالفین ہی کی کتب سے اقتباسات انتخاب کر کے مرتب کی گئی ہے۔اور عماد الدین کے اعتراضات کا انھیں کے بڑے بڑے ثقہ اور معتمد علما وفضلا کے اقوال سے جواب دیا گیا ہے۔جس امر کو وہ اعتراض کی صورت میں پیش کرتا ہے ان کا جواب اسی طرح دیا گیا ہے کہ جب آپ ہی کے بڑے بڑے علما آنحضرتؐ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں ۔آپ کے شبہات اور اباطیل کیا وقعت رکھتے ہیں؟ساری کتاب محض اقتباسات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اکثر مقامات پر موئف نے اقوال کی تائید اور بطورِ حاشیہ یا ضمیمہ اقوال کی تشریح اور توضیح بھی کی ہے۔یہ اضافے انھوں نے اس طرح کیے ہیں کہ عام قاری کو بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔کہ کونسا بیان موئف کا ہے اور کونسا علمائے نصاریٰ کا؟''فضائل اسلام فی ذکرِ خیر الانام''چار ابواب پر مشتمل ہے۔ مقدمے میں رسولِ خدا سے پیشتر عرب کا جو حال تھا وہ مخالفین ہی کی زبان میں مندرج ہے۔اس میں رسومات ،جاہلیت ،دستورات عرب اور طرزِ حکومت وغیرہ کا حال درج ہے۔پہلے باب میں آنحضرتؐ کی ولادت سے آغاز نبوت تک کا حال اور تمام اعتراضات کی تردید مخالفین کے اقوال سے ہی کی گئی ہے۔دوسرے باب میں آغاز نبوت سے ہجرت تک کا حال علمائے نصاریٰ کے اقوال کی صورت میں درج کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں ہجرت سے وفات تک کا حال معہ غزوات ،ترتیب وار، سال بہ سال ،اعتراضات کے جواب کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔اس باب میں جہاد، تحویل قبلہ، کثرت ازدواج اور تقدیر پر خصوصی بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں عیسائی علما کے اقوال درج کیے گئے ہیں۔چوتھا اور آخری باب نہایت اہم ہے جس میں اسلام کی فضیلتیں ،مسلمانوں کے علوم اور کارہائے نمایاں ،پیغمبر اسلامؐ کے کارنامے اور جانفشانیاں ،اسلام کی صداقتیں اور اس کی تعلیمات ،واحدانیت اور امر و نہی مستند اور معتبر علمائے نصاری کے اقوال کے بموجب درج کیے گئے ہیں۔چونکہ مخالفین کا اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں اس قسم کی شہادت دینا اسلام اور اس کی کمال عظمت اور فضیلت کا بین ثبوت ہے۔اس لیے اس تالیف کا نام ''فضائل اسلام فی ذکر خیر الانام المعروف سیرت النبیؐ''یا''تاریخ محمدیؐ''رکھا گیا ہے۔

مولوی صاحب موصوف نے اس تالیف کو جن علمائے نصاریٰ کے اقوال اور آرا سے مزین کیا ہے۔ان کے اسماء اور تصانیف و تالیفات مندرجہ ذیل ہیں:ایڈورڈگبن ،جارج سیل (ترجمہ قرآن)،پادری فانڈر(تواریخ محمدیؐ) بشب مڈلٹن ،جارج ڈیینپورٹ(اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن)،(اردو ترجمہ)،عطاالحق یا موید الاسلام ،ریوریںڈر راڈویل(ترجمہ قرآن)،مسٹر طامس کار لائل(ہیروز اینڈ ہیروزشپ) ،ماسٹر رامچندر(تحریف القرآن) جے ولسن ،سر ولیم میور(لائف آف محامسٹ،اُردو تواریخ کلیسا ،تاریخ محمدیؐ)پادری صفدر علی،ڈاکٹر اے سپر نگر(سیرت محمدیؐ)،پادری رجب علی،ہارن صاحب(تفسیر قرآن)پادری باس ورتھ سمتھ اور ایزک ٹیلر علاوہ ازیں اناجیل مروجہ اور چیمبرس انسائیکلوپیڈیا سے بھی مدد لی گئی ہے۔اس تالیف کا اسلوب مولوی صاحب کی باقی تصانیف کے اسلوب سے قدرے مختلف ہے کیونکہ یہ مولوی صاحب کی پہلی تالیف ہے اور اس وقت تک ان کا قلم اتنی

روانی سے نہیں چلتا تھا۔ اگرچہ اس میں زیادہ تر علماء نصاریٰ کے اقوال ہی درج ہیں۔ تاہم اقوال پر تبصرے کی صورت میں ان کا اسلوب نمایاں نظر آجاتا ہے۔ یہاں بھی انھوں نے سادہ اور چھوٹے چھوٹے جملے اور آسان الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ قائل کرنے کا انداز منطقی ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی مولوی فیروز الدین کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں: مولانا ڈسکوی کا طریق استدلال منطقی ہے۔ لیکن ان کی عام فہم اور دلچسپ عبارت، مطالب کو بوجھل نہیں ہونے دیتی۔

سیرت النبیؐ کے سلسلے میں مولوی فیروز الدین ڈسکوی کی تیسری تصنیف ''سیرت المصطفےٰؐ'' ہے۔ اس میں موئف نے آنحضرتؐ کے اخلاق فاضلہ و اوصاف جمیلہ کا بیان کیا ہے مگر شروع میں آپؐ کی مختصر سوانح عمری بھی دی گئی ہے۔ جس کے پڑھنے سے حضورؐ کی صداقت رسالتؐ کی حقیقت آفتاب نصف النہار کی طرح منکشف ہو جاتی ہے۔ اس سوانح عمری میں آنحضرتؐ کی زندگی کے اہم واقعات: نبوت و شریعت کا عطا ہونا، اعلانیہ دعوتِ اسلام، ہجرتِ حبشہ، حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ کا اسلام لانا، شعبِ ابی طالب میں محصور ہونا، سفر طائف، ہجرتِ مدینہ، مدینہ کے حالات، مدینہ میں آپؐ کی تشریف آوری، مسجد نبویؐ کی تعمیر، اذان کا تقرر، جہاد کی ابتدا، جنگِ بدر کا معرکہ، غزوہ اُحد، غزوہ خندق، صُلح حدیبیہ، بادشاہوں کو دعوتِ اسلام، فتح خیبر، فتح مکہ، جنگِ تبوک، مسجد ضرار، نصارائے نجران سے مباہلہ، حجتہ الوداع اور آپؐ کا حلیہ مبارک نہایت اختصار سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد آپؐ کے اخلاق و اوصاف کا حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے آپؐ کی بے تکلفی و ظرافت، عقل و دانائی، حلم و ملائمت، عفو و رحم، شجاعت و مردانگی، جود و سخاوت، خوش بیانی، صحابہؓ پر آپؐ کی تعلیم کا اثر، دوسروں کی عزت و تکریم، عبادت وریاضت تقویٰ، زہد، دنیا سے بے رغبتی، رسالتؐ، خدا کے لیے تبلیغ، توحید الہٰی کے خیال سے اپنی تعظیم کی ممانعت، سادہ گزران، فقر وفاقہ، راست بازی، صداقت، کتاب الہٰی کی تعلیم، حکمت اور تہذیب کی باتوں کو عقیدت مندانہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اس کے بعد دو سو منتخب احادیث نبویؐ کا منظوم اردو ترجمہ دیا ہے۔ آپ کی تعلیمات کا خلاصہ بیان کرنے کے بعد خلفائے راشدینؓ اور حضرت حسنینؓ کی مختصر سوانح عمری اور کارنامے بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اس مختصر کتاب میں حالات نبویؐ کا ذخیرہ اس قدر جمع ہے کہ بڑی بڑی کتابوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس میں اخلاق محمدؐ کا ہی بیان نہیں ہے بلکہ سرکارِ دوعالمؐ کی زندگی سے مثالوں سے اس کتاب کو آراستہ کیا ہے۔

آنحضرتؐ کے اخلاق فاضلہ کا بیان اس طرح کیا ہے کہ اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ آپؐ صرف اعتقادی طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی سید المرسلینؐ، افضل البشرؐ، خاتم الانبیاؐ ہیں۔ اس کتاب کا اسلوب بہت سادہ ہے۔ اس میں عبارت آرائی سے پرہیز ہے۔ ہر جملے سے عقیدت اور محبت ٹپکتی ہے۔ اس کتاب میں بھی مولانا موصوف نے ضمناً عیسائیوں اور آریائوں کے اسلام اور قرآن پر اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ اس کتاب سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس سے ان کے اسلوب کی خصوصیات واضح ہو جائیں گی: آپؐ پڑھے لکھے نہ تھے، مگر عالم و جاہل دونوں کو ہی تعلیم کرتے تھے۔ آپؐ کے چہرے پر ایسا عظمت و جلال کا نور برستا تھا کہ اس کا اثر ہر شخص کو پہنچتا تھا۔ آپؐ حیا میں نا کتخدا یعنی بن بیاہی لڑکی سے بڑھ کر تھے۔ آپؐ اپنے ماتحتوں پر بہت مہربان تھے۔ اپنے خادم کو کبھی

نہ جھڑکتے۔ آپؐ کے خادم انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ میں دس برس تک آپؐ کی خدمت میں سرفراز رہا۔ اس درمیان میں آپ نے کبھی اُف تک نہیں کہا۔ آپؐ اپنے عزیزوں سے بہت محبت رکھتے۔ مولوی فیروزالدین کی تصنیف ''الوہیت مسیح اور تثلیث کا رد'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں فاضل مصنف نے اللہ تعالیٰ کی صفات قرآن اور خصوصاً سورۃ اخلاص کی روشنی میں بیان کر کے عیسائیوں کے تصورِ خدا اور عقیدہ تثلیث پر روشنی ڈالی ہے۔ براہین عقلی سے ان کے تضادات کے خلافِ عقل اور خلافِ فطرت ہونا ثابت کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ عیسائیوں کے یہ اعتقادات خود تراشیدہ خیالات ہیں جن پر نہ کوئی عقلی دلیل قائم ہوتی ہے اور نہ نقلی بلکہ اصل تورات اور انجیل سے ان کے ان اعتقادات کی نفی ہوتی ہے۔ مولانا موصوف کا طرزِ استدلال ملاحظہ ہو: باپ، بیٹے کا عمر، درجہ اور ہر بات میں مساوی ہونا کس قدر قابلِ تمسخر اور واہیات ہے۔ مسیح اگر خدا کا بیٹا ہے تو ازلی نہیں جو ازلی ہے تو خدا کا بیٹا نہیں۔ یہ دونوں صفات متضاد وجود واحد میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ مسیح اگر خدا کا بیٹا ہے تو ازلی نہ ہونے کی وجہ سے خدائی کے لائق اور خدا نہیں۔ دونوں باتیں نہیں ہو سکتیں۔ چوپڑی اور دو دو، ایسا ٹھیک نہیں۔ خدا کا بیٹا قرار دو تو ازلی نہ ہونے کی وجہ سے خدا مت سمجھو ازلی قرار دو تو بیٹے کا مفہوم بعدیت کو چاہتا ہے۔ بیٹا مت کہو یہ کیا بات ہے کہ تم بیٹے کا وجود باپ سے ۱۰۔۱۵ برس بھی موخر نہیں سمجھتے ہو اور پھر بیٹا کہتے ہو، ایسا بیٹا کہاں سے آ گیا؟

مولوی صاحب نے عیسائیوں کے عقائد کا بطلان اور اسلامی عقائد کو برحق کرنے کے لیے قرآن مجید، تورات، انجیل دیگر آسمانی کتابوں سے آیات اور علمائے نصاریٰ کے اقوال کو بھی بطور دلیل درج کیا ہے۔ ''الوہیت مسیح اور تثلیث کا رد'' کے دوسرے حصے میں مولوی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ انجیل میں جہاں کہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تثلیث کا ذکر ہے وہ جعلی اور الحاقی ہے۔ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش محض امر الٰہی سے ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ اصل تورات اور انجیل سے خالص توحید کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے عیسائی علما کے اقوال کو ہی سند کے طور پر پیش کیا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں: ایک نہایت مشہور انگریز، مسٹر جان ڈینپورٹ صاحب اپنی کتاب ''اپالوجی فار محامٹ اینڈ قرآن'' میں لکھتے ہیں کہ نیٹن صاحب، افضل حکما انگلستان اور گبن صاحب اور علما و مورخین نصاریٰ نے بڑی کوشش سے ثابت کیا ہے کہ جن آیات انجیل سے مسئلہ توحید مستنبط کیا گیا ہے۔ یعنی یوحنا کا پہلا خط ۵ باب اور ۷ وہ آیات اختراعی ہیں۔ اس کتاب کا اسلوب نہایت سادہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں اور ان میں لفظی مناسبت کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

پادری عماد الدین پانی پتی، جو اپنی پت پرانے پادریوں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں۔ ہدایت المسلمین کے صفحہ نمبر ۱۰۳ میں مقرر ہو گئے کہ ضرور آیت نامہ اول یوحنا کی ۵ باب اور ۷ آیت مشکوک ہے یعنی نہیں معلوم مصنف کی ہے یا حاشیہ ہے۔ ''عیسائیوں کی دینداری کا نمونہ'' تصنیف میں مولانا ڈسکوی نے مختلف دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ انجیل مروجہ محرف ہیں اور اس کے مقابلے میں قرآن از اول تا ابد دم اپنی اصل حالت میں موجود ہے: عیسائیوں کی کتاب مقدس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اس

قدر الحاق واختلاف تبدیل و تحرف کو دخل ہوا ہے کہ عیسائی علما مجبوراً قائل ہو گئے ہیں کہ اس میں اس حد تک اختلاف عبارت یا الفاظ ہیں جسے وہ سہو کاتب کے نام سے منسوب کرتے ہیں کہ ہر حال میں تمام یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ صحیح کون ہے؟ مولوی فیروز الدین ڈسکوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب ان کی کتاب ہی اصلی حالت میں نہیں ہے تو اس سے عقائد کیسے اخذ کیے جاسکتے ہیں؟ وہ اپنی اس تصنیف کا مقصد یوں بیان کرتے ہیں:

میں چاہتا ہوں کہ عیسائیوں کی مقدس کتاب کا مشتبہ اور محرف ہونا، بطور نمونہ اس رسالہ میں درج کروں تا کہ تمام دنیا پر آشکار ہو جائے کہ عیسائی صاحبان کی کتاب میں یہاں تک تبدیل و تحریف اور الحاق و اختلاف کو دخل ہوا ہے۔ اور ہو رہا ہے۔ تو وہ کیسے قابلِ استشنا ہو سکتی ہے۔ اور اس پر عیسائی مذہب کی بنیاد گویا ریت پر بنیاد ہے یا نہیں؟ مولانا موصوف نے انجیل کے مختلف چھپے ہوئے نسخوں کا موازنہ کر کے مثالوں، دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ اناجیل مروجہ محرف ہیں لیکن عیسائی بڑی چالاکی سے اس تحریف کا انکار کرتے ہیں۔ مولوی صاحب نے صرف چھے نمونے دینے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ انھوں نے اناجیل کے محرف اور قرآن کے غیر محرف ہونے کی نسبت مندرجہ ذیل علمائے نصاریٰ کے اقوال کو بطور دلیل درج کیا ہے۔ گاڈفری ہیگنس، مسٹر جان ڈینورٹ، مسٹر لارڈنر صاحب، ہارن صاحب، پادری فانڈر، سر ولیم میور، پلوس صاحب، فاسٹس صاحب اور پادری دیر صاحب۔ مولوی فیروز الدین نے ایک مقالہ "اسرار التنزیل" ۲۴ جنوری ۱۸۹۶ء میں انجمن حمایت اسلام کے گیارہویں سالانہ جلسے منعقدہ ۲۴ جنوری کے لیے تحریر کیا۔ مگر اچانک طبیعت علیل ہو جانے کی وجہ سے وہ جلسے میں نہ جاسکے۔ خلیفہ عبدالرحیم نے ان کی طرف سے یہ مقالہ پڑھا۔ "نماز اور اس کی حقیقت" تصنیف میں مولانا نے نماز کی فضیلت کو معترفین اسلام کا جواب دیتے ہوئے بیان کیا ہے۔ مضامین کی فہرست میں ۳۸ مطالب شامل ہیں۔ نماز کی فضیلت کے بارے میں لکھتے ہیں:

اگر غور و فکر اور تامل سے تمام خدا کی بنائی ہوئی چیزوں پر نگہ کرے۔ تو سب کی سب اپنے اپنے طور پر خدا کی عبادت کر رہے ہیں۔ چوپائے اور طیور اسی کے آگے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ رینگنے والے جانور اس کے سامنے سجدہ کر رہے ہیں۔ افلاک اور کواکب اس کے ولولہ عشق میں گھوم رہے ہیں اور حرکت دوری سے نماز ادا کر رہے ہیں۔ اگر اس کی عبارت میں یہ سب مخلوقات کے طریق عبادت جمع ہو جائیں تو کیا ہی افضل بات ہے۔ مولانا فیروز الدین کی تصنیف "سلسلہ جدید فیروزی" اسلام کے بارے میں پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں اسلام کے بنیادی مسائل نہایت آسان اور سلیس زبان میں سمجھائے گئے ہیں۔ یہ کتابیں بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں اور زبان بھی بچوں کی استعداد کے مطابق استعمال کی گئی ہیں۔ ہر ایک کتاب میں نثر کے ساتھ ساتھ نظم کا کچھ حصہ بھی شامل ہے۔ ہر کتاب کا تعلق اسلام کے کسی رکن کے ساتھ ہے۔ ان کی ایک کتاب نماز پر دوسری روزہ پر، تیسری حج پر، چوتھی زکوۃ پر اور پانچویں ایمان کے موضوع پر ہے۔ یہ تصانیف اس اعتبار سے اہم ہیں کہ آج سے تقریباً ایک صدی پہلے جب کہ برصغیر پر کفر و الحاد اور اسلام کے خلاف شکوک و شبہات کے بادل منڈلا رہے تھے۔ مولانا ڈسکوی نے نہ صرف پختہ عمر کے لوگوں کے لیے

اسلام کی تعلیم عام کی بلکہ بچوں کے لیے بھی مذہبی تعلیم کا ان کتابوں کے ذریعے اہتمام کیا۔ مولوی صاحب نے قرآن مجید کا ترجمہ، اُردو نثر، اردو نظم اور پنجابی نظم میں کیا ہے۔ تفسیر طلب امور کی تفسیر حاشیے میں دی گئی ہے۔ اس تفسیر میں مسائلِ اسلام کو مفصل بیان کیا گیا ہے۔ ضمناً عیسائیوں اور آریہ مت والوں کے اعتراضات کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ اس تفسیر کو پڑھ کر ہر آدمی کامل مناظر اور مباحث بن سکتا ہے۔

انھوں نے سورہ یٰسین، سورۂ رحمن، سورہ ملک، سورہ مزمل اور سورہ نبا کا اُردو نثر میں ترجمہ "پنجسورہ بے نظیر" کے نام سے کیا ہے۔ آخری چار سورتوں کی تفسیر "ربع اخیر کی نادر تفسیر" کے نام سے کی ہے۔ مولوی صاحب کے اُردو ترجمے کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ ترجمے کی خاص خوبی یہ ہے کہ قوسین میں مطلب کی ادائی اس طرح کر جاتے ہیں کہ تفسیر خود بخود ہی ہو جاتی ہے۔

سورہ یٰسین کی ابتدائی آیات کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

اے سرورؐ عالم قرآن کی قسم، جس میں سراسر، حکمت کی باتیں ہیں کہ یقیناً تو پیغمبروں کے سلسلے میں ایک ہے اور دین کی سیدھی راہ پر قائم ہے۔ یہ قرآن زبردست اور مہربان خدا نے اتارا ہے تاکہ تو ان لوگوں کو قہر الٰہی سے ڈرائے جن کے باپ دادا مدت سے نہیں ڈرائے گئے اور اس لیے وہ دین سے غافل ہیں۔ مولوی صاحب کے بیان میں زور ہے۔

سورہ رحمن کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اللہ اکبر، اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ظاہری باطنی، دینی اور دنیاوی نعمتوں کو کس شان و شوکت اور دھوم دھام سے بیان کیا ہے اور کس اعلیٰ ترین فصاحت اور بلاغت کے ساتھ اپنے احسانات و انعامات کو ظاہر کیا ہے۔ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے تو پورا قرآن مجید یکساں واقع ہے۔ کہیں تفاوت نہیں، مگر طرز اور اسلوب ہر سورت کا ایک دوسرے سے نرالا ہے۔ اور اس سورت کا ڈھنگ اور نظم بیان تمام سورتوں سے نادر اور عجیب تر ہے۔

مابعد جدید کے نظریہ کا اصل مقولہ

احمد سہیل

میرے تقریباً آدھی صدی کے ادبی سفر میں میرا زیادہ تر وقت ادبی نظریئے کی تنقید اور اس کی تفہیم اور تشریح میں گذرے۔ اس حوالے سے میں نے چار کتابیں 'جدید تھیٹر'، ساختیات'، تنقیدی تحریرین اور 'تنقیدی مخاطبہ' کے نام سے چار کتابیں لکھی اور سیکڑو مضامین ادب کے تنقیدی نظریئے پر لکھے جو اردو اور انگریزی کے ادبی اور علمی جرائد میں شائع ہوئے۔ میں نے یہ محسوس کیا کی اردو کا ادبی اور تنقیدی محاول ادبی تنقیدی نظریئے میں زیادہ سنجیدہ نہیں ہے یا شاید اس کو یہ سمجھ نہیں آتا۔

یہ خاکسار آج مابعد جدید نظریئے پر اساسی اور چند اہم نکات پر مختصر ابات کرے گا۔ اور یہ بھی چاہوں گا کی شفاف اور آسان زبان میں "مابعد جدیدت" کا مفہوم واضح ہو جائے۔

مابعد جدیدت کیا ہے؟

مابعد جدیدیت ایک ادبی صنف اور اسلوب کے لیے ایک اصطلاح ہے جو 20ویں صدی کے دوسرے نصف میں ابھری۔ مابعد جدیدیت کی تعریف میں، ادب نئی خوبیوں اور خصوصیات کو اپناتا ہے جو اس سے پہلے کی دہائیوں میں نہیں تھیں۔ مابعد جدیدیت پسند مصنفین نے اپنی زندگی کے دوران دنیا میں رونما ہونے والے اہم واقعات کے گرد اپنے شدید احساسات کو تلاش کرنے کے لیے قائم کردہ ادبی کنونشنوں کو کمزور کرنے کی کوشش کی۔

ایک عام اور وسیع تر اصطلاح جس کا اطلاق ادب، فن، فلسفہ، فن تعمیر، افسانہ، اور ثقافتی اور ادبی تنقید پر ہوتا ہے۔ مابعد جدیدیت بڑی حد تک سائنسی، یا مقصدی، حقیقت کی وضاحت کی کوششوں کے مفروضہ یقین کا رد عمل ہے۔ جوہر میں، یہ ایک تسلیم سے پیدا ہوتا ہے کہ حقیقت صرف اس کے انسانی فہم میں آئینہ دار نہیں ہے، بلکہ اس کی تعمیر اس وقت ہوتی ہے جب ذہن اپنی مخصوص اور ذاتی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس وجہ سے، مابعد جدیدیت ان وضاحتوں کے بارے میں انتہائی شکوک و شبہات رکھتی ہے جو تمام گروہوں، ثقافتوں، روایات یا نسلوں کے لیے درست ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، اور اس کے بجائے ہر فرد کی نسبتی سچائیوں پر توجہ مرکوز کرتی ہیں۔ مابعد جدید کی تفہیم میں، تشریح ہی سب کچھ ہے۔ حقیقت صرف ہماری تشریحات کے ذریعے وجود میں آتی ہے کہ دنیا ہمارے لیے انفرادی طور پر کیا معنی رکھتی ہے۔ مابعد جدیدیت تجریدی اصولوں پر ٹھوس تجربے پر انحصار کرتی ہے، ہمیشہ یہ جانتے ہوئے کہ کسی کے اپنے تجربے کا نتیجہ یقینی اور آفاقی کے بجائے لازمی طور پر غلط اور رشتہ دار ہو گا۔

مابعد جدیدیت "پوسٹ" یا 'مابعد' یا 'پس' ہے کیونکہ یہ کسی بھی حتمی اصول کے وجود سے انکار کرتی ہے، اور اس میں سائنسی، فلسفیانہ یا مذہبی سچائی ہونے کی امید کا فقدان ہے جو ہر ایک کے لیے ہر چیز کی وضاحت کرے گا - نام نہاد "جدید" ذہن کی ایک خصوصیت۔ مابعد جدید پوزیشن کا تضاد یہ ہے کہ تمام اصولوں کو اپنے شکوک و شبہات کے دائرے میں رکھتے ہوئے اسے یہ سمجھنا

چاہیے کہ اس کے اپنے اصول بھی سوال سے بالاتر نہیں ہیں۔ جیسا کہ فلسفی رچرڈ ٹرناس کا کہنا ہے کہ مابعد جدیدیت "اپنے اصولوں پر بالآخر خود کو اس سے زیادہ درست ثابت نہیں کر سکتی جس کے خلاف مابعد جدید کے ذہن نے خود کو بیان کیا ہے۔

مابعد جدیدیت، ادبی نظریئے کی بہت سی تحریکوں کی طرح، نظریات، اصولوں، جمالیاتی اقدار اور طریقوں کا ایک غیر منظم مجموعہ ہے۔ اسکالرز اب بھی مابعد جدیدیت کی تعریف کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، بنیادی طور پر اس لیے کہ مابعد جدیدیت اس کے فلسفے کی نوعیت کے اعتبار سے ناقابل وضاحت ہے۔ کچھ لوگ استدلال کرتے ہیں کہ مابعد جدیدیت سے مراد جاری سماجی اور ثقافتی دھارے ہیں جو کہ 1960 کی دہائی سے شروع ہونے والی مخصوص خصوصیات کے حامل ہیں، یہ دور جدیدیت کے بعد تھا۔

مابعد جدیدیت: ادبی تنقید اور نظریہ میں، مابعد جدیدیت کا ایک تجزیاتی پیمانہ {ٹول} ہے جو فرد سے متعلق ادب کی معاشرتی سیاسی بنیادوں اور محرکات پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ مابعد جدید ادبی نظریئے {تھیوری} کا زیادہ تر حصہ نظریہ نگاروں کے تجویز کردہ فلسفیانہ یا تنقیدی گفتگو سے بنا ہے یا اس سے متاثر ہے جو کہ اصل میں ادبی تنقید کے لیے نہیں تھے۔ مابعد جدیدیت کو سمجھنے کے لیے، ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ یہ کس چیز کی مخالفت کرتا ہے

مابعد جدید ادبی نظریئے کی خصوصیات اور اہم نکات

1۔ فن اور علم سے متعلق مفروضہ نظریات اور اصولوں کا رد۔

بیانیے کو مکمل کرنے کی تنقید (عظیم یا اعلیٰ بیانیہ) اور ایک مشترکہ معروضی حقیقت یا آفاقی سچائیوں کے تصور پر سوال اٹھانا۔

2۔ فلسفیانہ بنیاد پرستی کا رد جو ایک ٹھوس بنیاد کے امکان کے بارے میں بات کرتی ہے جس پر ہم اپنے علمی نظام کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

3۔ فن اور ادب کے کاموں میں دونوں کی خصوصیات کو یکجا کر کے اعلیٰ فن اور ادنیٰ فن کے مابین حدود کو توڑنا۔

4۔ اس عقیدے کا رد کہ الفاظ اور تصورات میں موروثی معنی ہوتے ہیں جو پہلے سے موجود حقیقت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

5۔ مابعد جدیدیت کو انفرادیت کے بحران کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو دیر سے سرمایہ داری اور اعلیٰ جدیدیت نے جنم لیا ہے۔

6۔ بیانیہ تکنیکوں کے طور پر بین متن، پیسٹیچ اور پیروڈی کا استعمال۔

7۔ مابعد جدید تحریروں میں ٹکڑا اور متضاد اور غیر خطوطی بیانیہ مابعد جدید کی موضوعیت {سبجیکٹیویٹی} کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

8۔ اس بات پر زور دینے کے لیے کہ زندگی کا کوئی موروثی مطلب نہیں ہے جسے ہم جاننے کے اہل ہیں۔

مابعد جدید ادبی نظریئے کے کلیدی نکات

*مابعد جدید ادبی نظریہ جدیدیت کی تنقید اور جدیدیت پسند جمالیاتی اور ادبی اسلوب سے ہٹ کر اپنی جداگانہ شناخت اور خصوصیت ہے۔

*مابعد جدیدیت کا افسانہ مطلق کے خیال کو مسترد کرتا ہے اور انتشار، انتشار، اور حقیقت کے ٹکڑے ہونے کو قبول کرتا ہے۔

*غیر معتبر راوی، بیان میں چنچل پن اور بین متنوعیت اکثر مابعد جدید ناول کے نشانات ہیں۔

*مابعد جدیدیت کے افسانوں کے ساتھ میٹا فکشن اور خود حوالہ انداز کا تعلق اکثر ہوتا ہے۔

*مابعد جدیدیت کے نظریہ اور افسانے کی ایک اہم خصوصیت متن کے اندر معین اور مطلق معنی تلاش کرنے میں دشواری ہے۔

مابعد جدیدیت کا ادبی نظریئے کے بارے میں میرے قارئین اور دوستوں کی جانب سے برسوں سے کچھ اس قسم کے سوالات دریافت کرتے رہے ہیں۔ انکے کچھ جوابات یوں دیئے جاسکتے ہیں۔

مابعد جدید تحریریں اکثر ادبی آلات کا استعمال کرتی ہیں جیسے میٹا فکشن، پیروڈی، ناقابل اعتبار، بکھری ہوئی اور غیر لکیری بیانیہ۔

مابعد جدید ادب کے موضوعاتی رجحانات میں انفرادی موضوعیت اور معاشرتی مسائل دونوں شامل ہیں۔

مابعد جدیدیت نے فن اور علم سے متعلق مفروضہ نظریات اور اصولوں کو مسترد کر دیا۔

اعلیٰ اور ادنیٰ فن کے درمیان کی سرحدیں دھندلی تھیں۔

متن اور معنی کے درمیان تعلق کی تجدید تعریف مابعد جدیدیت کی ایک اور خصوصیت تھی۔

سادہ الفاظ میں، مابعد جدید ادبی نظریہ کو مابعد جدید فلسفہ سے متاثر ادبی تجزیہ کے ایک طریقہ کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ مابعد جدیدیت ہم آہنگی اور عقلیت میں جدیدیت کے عقیدے اور ثقافت میں عظیم سچائیوں کے خیال کو شریک نہیں کرتی ہے۔ وہ نظریات اور نقطہ نظر کے درجہ بندی کو ختم کرتے ہوئے انفرادی بیانیہ اور نقطہ نظر کی طرف توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دیگر تنقیدی نظریات کی طرح، مابعد جدیدیت بھی ان انجمنوں کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے جو ادب کے کسی کام کے اندر موجود ہیں اور اس کے اس دنیا کے ساتھ جس کی وہ نمائندگی کرتی ہے۔ ادبی نقاد اکثر دنیا کے کاموں کا تنقیدی تجزیہ کرنے کے لیے تحریری لفظ کو ایک آلہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مابعد جدید ادبی نظریہ کام اور ثقافت کے بعض پہلوؤں، جیسے معنی، موضوعیت اور انفرادی تجربے کے درمیان تعلق کو دیکھنے کی طرف زیادہ مائل ہے۔

فرانسیسی ژان فرانسکو لیوٹارڈ، ژان بودیلیر، ژاک دریدا، مائیکل فوکو، امریکہ نقاد فریڈرک جیمسن، فیلکس گاتیری ڈیلوس رچرڈ روٹی ماجدیت نظریئے کے بااثر اور اہم نام ہیں۔

مابعد جدید نظریہ کے نظریات کو متاثر کرنے والے ایک فرد کی شناخت کرنا مشکل ہے۔ پوسٹ ماڈرن کی اصطلاح فرانسیسی فلسفی ژاں فرانکوئس لیوٹارڈ نے وضع کی تھی۔ فلسفی اور نقاد جیسے فریڈرک جیمسن، مائیکل فوکو، اور رچرڈ روٹی کچھ ایسے نظریہ دان ہیں جنہوں نے مابعد جدید ادبی تنقید کے نظریہ اور عمل میں اپنا حصہ ڈالا۔

اُردو میں افسانوی تنقید کا نیا پیراڈائم اور آصف فرخی "عالمِ ایجاد" کی روشنی میں

ایم۔ خالد فیاض

اکیسویں صدی میں سنجیدہ تنقید کا پورا اسٹکچر بدل گیا ہے۔ تھیوری اور فکشن کے حوالے سے بیانیات کے مباحث نے فکشن کی تنقید کا پورا پینترا ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس ذیل میں مغرب میں تو بے شمار کام ہو رہا ہے لیکن ہمارے ہاں بھی چند ناقدین ہی سہی کچھ نہ کچھ عمدہ کام کر رہے ہیں۔ ان میں گوپی چند نارنگ، شمس الرحمن فاروقی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے بعد قاضی افضال حسین اور شافع قدوائی کی مثالیں تو سامنے کی ہیں جب کہ ڈاکٹر ناصر عباس نیئر نے فکشن کی اب تک جو تنقید کی ہے اُس کا حاوی رجحان یہی ہے۔ آصف فرخی کی افسانوی تنقید کے بارے میں ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ سراسر بیانیات کے ڈسپلن کے تابع ہے اور اس تھیوری سے کہیں انحراف نہیں کرتی؛ ہاں مگر اس تنقید کی نمایاں صورت، بیانیات کے بنیادی مباحث سے توانائی ضرور حاصل کرتی ہے۔

کسی فن پارے میں ''کیا'' ہے کی بحث اب اُس طرح معنویت کی حامل نہیں رہی جیسے اس سے پہلے مسلسل رہی ہے، اب افسانوی تنقید کا بنیادی سروکار ''کیسے'' سے ہوتا جا رہا ہے۔ مطلب یہ کہ بیانیات کی بحث (جس میں تھیوری کا عمل دخل ہے) میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک افسانوی متن کیسے بامعنی بن رہا ہے یا بنتا ہے، یا یہ کہ کیسے ایک تخلیق کار اپنے فن پارے کی سیٹنگ کرتا ہے کہ وہ بامعنی بن جاتا ہے۔ اس ''کیسے'' کے ساتھ خود بہ خود ''کیوں'' بھی جڑ جاتا ہے۔ مثلاً اس افسانوی فن پارے میں کیوں یہی طریقۂ کار اختیار کیا گیا۔؟ کیوں ایسی ہی سیٹنگ کی گئی ہے وغیرہم۔؟ یہ سوالات بھی بیانیات کے ڈسپلن کو تقویت دینے کا باعث بنتے ہیں۔ آصف فرخی کی تنقیدی کتاب ''عالمِ ایجاد'' میں دیگر پہلوؤں کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی نمایاں ہے۔

"عالمِ ایجاد" آصف فرخی کی پہلی تنقیدی کتاب ہے جو ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی اور جس میں ۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۲ء میں لکھے گئے دس مضامین شامل ہیں۔ یہ دس کے دس مضامین کسی نہ کسی حوالے سے اُردو فکشن یا اُردو فکشن کی تنقید سے بحث کرتے ہیں۔ یہ مضامین بتاتے ہیں کہ آصف فرخی اُردو میں فکشن کے حوالے سے بالخصوص روایتی تنقیدی مباحث اور طریقۂ کار سے اصولی اختلاف بھی رکھتے ہیں اور اپنا ایک نقطۂ نظر بھی؛ اور سب سے اہم بات یہ کہ اپنے نقطۂ نظر کو دلیل اور شواہد (جس میں وسیع مطالعے کا عمل دخل دیکھا جا سکتا ہے) کے ساتھ بیان کرنے کی تنقیدی قوت اور جرأت سے بھی مالا مال ہیں۔ "عالمِ ایجاد" کے بعد آصف فرخی کی دو اور تنقیدی کتابیں ''نگاہِ آئینہ ساز میں'' (۲۰۰۹ء) اور ''ایک کہانی نئے مضمون کی'' (۲۰۲۰ء) کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ بلاشبہ اِن میں بھی اُردو فکشن سے متعلق بیش تر مضامین خاصے کی چیز ہیں۔ اِن دو تنقیدی مجموعوں کے دوران ۲۰۱۶ء میں اُن کی انتظار حسین کے جہانِ فن کا تفصیلی احاطہ کرتی ہوئی تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کی کتاب ''چراغِ شبِ افسانہ'' شائع ہوئی؛ جو میرے نزدیک اب تک انتظار حسین کے فن پر ایک ایسی کتاب ہے جس سے زیادہ جامع کتاب لکھنے میں کسی نقاد کو ایک مدّت درکار

ہو گی۔ لیکن اس سب کے باوجود آصف فرخی کی افسانوی تنقید کا بنیادی نقطۂ نظر اور اُن کا طریقۂ کار واضح کرنے والی کتاب ''عالمِ ایجاد'' ہے۔ اسی لیے یہاں ہم نے اُن کی افسانوی تنقید کو سمجھنے کے لیے اسی کتاب کو موضوع بنایا ہے۔

سب سے پہلے ہم ذکر کریں گے اُن کے مضمون ''نصوح، ہیضے سے کتاب سوزی تک'' کا، جو اُن کا ایک اہم تنقیدی مضمون مانا جاتا ہے۔ ''توبتہ النصوح'' پر غور کرتے ہوئے آصف فرخی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نذیر احمد نے وباؤں میں سے اپنی اس مقصدی کتھا کے لیے ''ہیضے'' کا ہی انتخاب کیوں کیا؟ جو اس پورے قصے کا نقطۂ تحرک بنتا ہے۔ اس کے لیے کسی اور وبا مثلاً طاعون وغیرہ کو کیوں منتخب نہیں کیا گیا؟ یہ تو طے ہے کہ نذیر احمد نے وبا کو اپنے اخلاقی مقصد کے لیے استعمال کیا کہ بقول آصف فرخی ''وبا ایک وسیلہ یا بہانہ ہے، لوگوں کو درسِ عبرت دلا کر نیکو کاری و راستی کی طرف مائل کرنے کا۔'' (ص:۲۵) لیکن اس کے لیے شاید طاعون کی وبا زیادہ بہتر ہوتی۔ تو پھر ہیضہ ہی کیوں؟ کہیں کہانی کی ضرورت کے تحت ہی تو نذیر احمد نے ہیضے کا انتخاب نہیں کیا کہ اس سے ایک علامتی معنویت حاصل کی جا سکتی ہے؟ لیکن وہ علامتی معنویت کیا ہو سکتی ہے؟ اس سوال کی کھوج ہی میں آصف فرخی کو یہ نکتہ سوجھتا ہے۔ اُن کے خیال میں:

''ہیضے میں قے اور دست کی فراوانی کی وجہ سے اجتماعی لاشعور میں اس وبا کا ایک تعلق بسیار خوری سے بن گیا ہے جو بذاتِ خود حرص و ہوا اور طمع کی ایک علامتی شکل ہے۔ گو کہ اس وبا کا تعلق غذا کی آلودگی سے ہے نہ کہ کثرت اور پُر خوری سے۔ لیکن عام خیال میں یہ ضرورت سے زیادہ کھا جانے کی ایک سزا کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ چناں چہ قومی سطح پر اس علامت کی جو معنویت بنتی ہے، وہ خاصی واضح ہے۔ (اسی لیے) نصوح، نذیر احمد کے اعتبار سے پیٹ بھرا اور ناشکرا ہے، اس لیے اس کی کایا کلپ کے لیے ہیضہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ طاعون سے نذیر احمد کے اخلاقی و علامتی مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ اپنے عروج کے زمانے میں ہیضہ شدید نفسیاتی خوف کو جنم دیتا ہے کیوں کہ یہ بیماری آناً فاناً اثر کرتی ہے۔۔۔ چند گھنٹوں میں واقع ہو جانے والی موت صحیح معنوں میں ناگہانی معلوم ہوتی ہے۔۔۔ جسم چند گھنٹوں میں شکست و ریخت کی کئی منزلیں طے کر لیتا ہے اور ایسی حالت کو پہنچ جاتا ہے جس پر موت کی ہول ناکی کی ایسی اٹل حقیقت تحریر ہے جو زندہ بچ جانے والوں کو درسِ عبرت نظر آتی ہے۔'' (ص:۲۶ اور ۲۷) اس ناول میں جو کہا گیا ہے، آصف فرخی کو اُس سے تو اختلاف ہے مگر جس طرح کہا گیا ہے اس کے وہ قائل ہیں۔ نصوح کی غشی نما نیند کا فنی جواز بھی، ہیضے کی بیماری فراہم کرتی ہے اور خوب کرتی ہے۔ یہی وہ حالت ہے جس میں نصوح کو اپنی زندگی پر غور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ''یہ بیماری کا کرائسس بھی ہے اور نصوح کی زندگی کا بھی۔۔۔ عین مناسب بیانیہ تکنیک اور وبائی حملے کے علامتی معنی کے ذریعے نذیر احمد نے اس خواب کے لیے زمین پوری طرح ہموار کر لی ہے، جو نصوح کی اخلاقی قلب ماہیت کا موجب ہو گا اور قصے کو اس کے مطلوبہ اخلاقی نتائج کی طرف لے جائے گا۔'' (ص:۳۱) اسی لیے آصف فرخی اس ناول کے قصے کے نہیں، قصہ گوئی میں برتی گئی ہنر مندی کے قائل ہیں۔

اس ناول کی دوسری صفت وہ کش مکش یا تصادم ہے جس کا ذکر اگرچہ اکثر ناقدین نے کیا ہے لیکن اس کی توضیح شاید کسی نے یوں نہیں کی کہ ''کلیم اور نصوح کا یہ تصادم دراصل ہندوستانی مسلمانوں کے اجتماعی کردار کی دو انتہاؤں کا تصادم ہے۔ مسلمانوں کے قومی تشخص میں نصوح بھی مضمر ہے اور کلیم بھی پنہاں ہے۔ کبھی ایک حاوی ہو جاتا ہے کبھی دوسرا، لیکن دونوں اپنا یہ تضاد حل نہیں کر سکتے۔ 'توبتہ النصوح' کی ڈرامائیت اسی کش مکش سے اُبھری ہے۔۔۔ نصوح اور کلیم کے کرداروں نے اُس سرد جنگ کو درمیانے طبقے تک پہنچا دیا ہے جو ۱۸۵۷ء سے پیش تر خانقاہ اور دربار کی کش مکش تھی۔'' (ص:۳۶) اور پھر یہ کہ ''نصوح اور کلیم کا یہ تصادم نذیر احمد کے اتنے برس بعد بھی آج ہمارے معاشرے میں برپا عبقری کش مکش کی ایسی بھرپور تصویر ہے کہ اس کی دوسری کوئی اور مثال نہیں۔'' (ص:۴۴ تا ۴۵)

کلیم اصل میں آصف فرخی کا اس قدر پسندیدہ کردار ہے کہ اس مضمون کے پندرہ سال بعد اپنی دوسری تنقیدی کتاب ''نگاہِ آئینہ ساز میں'' کے ایک مضمون میں بھی، وہ کلیم کی وجہ سے اپنے لیے اس ناول ''توبتہ النصوح'' کا مصنف کہلایا جانا پسند کرتے ہیں۔ اور اعلانیہ کہتے ہیں کہ ''مجھے یہ ناول پسند ہے تو نہ نصوح کی وجہ سے نہ توبہ کے خیال سے، بلکہ کلیم کے لیے۔'' (ص:۱۴۱)

کلیم کا کردار ایک طرف تو باپ سے تصادم کی وجہ سے توجہ کا باعث بنتا ہے اور دوسری طرف ہمارے ناقدین کو اس حوالے سے بھی اپیل کرتا ہے کہ اُس کی ڈوریں نذیر احمد کے ہاتھ میں نہیں رہتیں اور وہ نذیر احمد کا ایک باغی کردار ہے؛ اور نذیر احمد کے ہر ناول میں ایسے ہی کردار اُن کے قصے میں جان ڈالتے اور اُسے ناول بننے میں مدد دیتے ہیں۔ آصف فرخی کا بھی یہی مؤقف ہے۔ اس ذیل میں، مَیں یہاں تک تو متفق ہوں کہ کلیم اور اس جیسے نذیر احمد کے دیگر کردار اُن کے بہترین کردار کہلائے جاسکتے ہیں لیکن یہ کہنا کہ اِن کی ڈوریں نذیر احمد کے ہاتھ میں نہیں رہتیں، میرے خیال سے زیادہ درست نہیں۔ کلیم بھی بہر حال نذیر احمد کے اس ناول کا ایک سیٹنگ کریکٹر ہی ہے؛ نذیر احمد نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے ایک مقررہ وقت تک کہ جب تک کش مکش اپنے عروج پر نہ پہنچ جائے، اُس کی ڈور خود ڈھیلی چھوڑی ہے اور آخر میں اُسی ڈور کو کھینچ کر کلیم کو ایسا پٹخا مارا ہے کہ وہ ہمیں نصوح اور نذیر احمد کے قدموں میں بے بسی کی تصویر بنا، پڑا ہُوا دکھائی دیتا ہے۔ ہاں آصف فرخی کی یہ بات نہایت اہم ہے کہ ''کلیم آکر پورے قصے کو transform کر دیتا ہے بلکہ وہ نصوح کی توبہ کے پورے قضیے سے transcend کر جاتا ہے۔'' (ص:۳۲) لیکن اس سب کے لیے داد، قصہ گو کو ہی دی جائے گی جس نے اپنے مقصد کو پانے کے لیے نظری طور پر ایک بالکل اینٹی کردار اپنے سامنے لا کھڑا کیا۔ آصف فرخی حیران ہیں کہ نذیر احمد نے کیسے کلیم کو برداشت کیا ہو گا، کس ہمت سے اُس کے مکالمے لکھے ہوں گے؟ تو عرض یہ ہے کہ نذیر احمد کو یہ حوصلہ یہ ہمت صرف اس لیے حاصل ہوئی کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ مجھ سے آزاد ہو کر کہاں تک جا سکتا ہے۔ اصل میں وہ کلیم کی حد بندی پہلے سے کر چکے ہیں۔

کتاب سوزی کے عمل کو آصف فرخی نے ''ثقافتی قتل کی ایک مکروہ صورت'' اور فاشسٹ رویہ گردانا ہے جو کسی طور غلط نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ آئیڈیالوجیکل وحشت ہے جس کا اظہار نصوح کے اس رویے سے ہوتا ہے۔ بقول آصف فرخی ''دولت آباد ایک لحاظ سے نذیر احمد کا اسلامی یوٹوپیا ہے جس میں سے اُنھوں نے شاعری کو اُسی طرح خارج کر دیا ہے جیسے افلاطون نے اپنی مثالی جمہوریہ سے خارج کر دیا تھا۔ اس ریاست کے منتظمین گاڑھی عربی زدہ اُردو بولتے ہیں، شعر پڑھنا گستاخی سمجھا جاتا ہے اور سب باریش مولوی ہیں۔'' (ص:۴۳) اور یہیں سے آصف فرخی ایک خطرناک سوال اُٹھاتے ہیں کہ ''کیا اسے جدید دَور میں اسلامی نظم و نسق کے مطابق چلنے والی ریاست کے تصور کا ابتدائی خاکہ کہا جا سکتا ہے؟'' (ص:۴۳) یہ نکتہ اگر آصف فرخی کے بجائے فتح محمد ملک کو سُوجھ جاتا تو پاکستان کا اوّلین خواب دیکھنے اور دِکھانے کا تاج کب کا نذیر احمد کے سَر سج چکا ہوتا۔

تنقید کا ایک اہم ترین کام اپنے عہد کے قائم کیے گئے فکری اور ادبی سوالوں کے تناظر میں ادب کو دیکھنا اور بحث کا حصہ بنانا بھی ہے۔ آصف فرخی کی تنقید یہ معاملہ مسلسل اپنے پیش نظر رکھتی ہے اس کی وجہ سے اُن کی تنقید میں تازگی کا شدید احساس جنم لیتا ہے اور فکری بالیدگی کا سامان بھی وافر مہیا ہوتا ہے۔ چاہے ''توبتہ النصوح'' کا معاملہ ہو یا کافکا جیسے تخلیق کار کی تفہیم کا مسئلہ؛ سب حوالوں سے آصف فرخی کا ذہن اس عہد کے قائم کیے گئے سوالوں سے نبرد آزما رہتا ہے۔

''پنجرہ پرندہ ڈھونڈتا ہے'' آصف فرخی کا ایک اور شاہ کار مضمون ہے۔ بہ ظاہر یہ مضمون کافکا سے متعلق دکھائی دیتا ہے (اور ہے بھی) لیکن حقیقت میں یہ کافکا کے ذریعے جدید افسانے کو سمجھنے، سمجھانے اور اُس کی شعریات مرتب کرنے کی ایک نادر مثال ہے۔ اس مضمون میں کافکا کو جدید افسانے کا معیار سمجھا گیا ہے لہٰذا آصف فرخی نے اُس کے ذریعے جدید افسانے کی شعریات وضع کی ہے۔ یہ الگ بات کہ اس کاوش میں کافکا سے متعلق بھی بڑی کام کی باتیں سامنے آتی ہیں اور اُسی کی بنیاد پر جدید افسانے کے خدوخال بھی نمایاں ہوتے ہیں۔

کافکا کی تحریروں اور فن کا تصور، آصف فرخی؛ کافکا کی ذات کے بغیر کرنے کو تیار نہیں۔ ''کافکا کا بے حد ذاتی رویہ اور اُس کا شخصی کرب، اُس کے فن کی وہ بنیاد ہے جس سے صرفِ نظر کر کے ہم کوئی وسیع تر معنیاتی دائرہ قائم نہیں کر سکتے۔۔۔ جلاوطنی کی سی ہراس، ایک مستقل خلش اور Alienation کی کیفیات کافکا کی واردات کے وہ عناصر ہیں جن سے اُس کی ادبی حیثیت نمو پاتی ہے۔ شاید وہ خود بھی اپنے وجود کی اساس، اپنی زندگی کا جوہر ترکیبی اسی میں پاتا تھا اور اس کے بغیر اپنی ادبی حیثیت کو کچھ نہیں سمجھتا تھا۔۔۔ وہ جس صنف کے پاس پہنچتا ہے اسے اپنے کرب کا حامل بنا دیتا ہے۔۔۔ کافکا کا افسانہ اس کی اپنی کہانی ہے۔۔۔ (لیکن) سرگزشت ہونے کے باوجود یہ افسانہ ہی ہے۔۔۔ (کیوں کہ) کافکا اپنا ذکر چھیڑتا ہے اور بیچ میں دُنیا آجاتی ہے۔'' (ص:۵۹ اور ۶۰) یہی حقیقت ہے۔ بڑا تخلیق کار اپنا بالکل ذاتی ذکر بھی کرے تو اُس میں دنیا آن بستی ہے اور طرح طرح کے افسانے ظہور میں آنے لگتے ہیں۔ اسی لیے ہمیں تخلیقی ذات کے کرشمے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

انسان اس دنیا میں جو کہ اُس نے نہیں بنائی، اکیلا ہے۔ یعنی اس دنیا میں فیصلے اور انتخاب کی گھڑی میں اکیلا ہے۔ اس اکیلے پن کا مشاہدہ ہم دیگر وجودیوں کے ساتھ ساتھ کافکا کے ہاں بھی کرتے ہیں۔ بقول آصف فرخی ''آج کی اس لمحہ بدلتی اور مشکل سے مشکل تر ہوتی ہوئی دنیا میں۔۔۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اکیلے پن کے ڈر کی یہ جھر جھری افسانہ ہے، بدلی ہوئی دنیا میں جدید افسانہ۔۔۔ کافکا جو اس ڈر اور جھر جھری کا نقطۂ عروج ہے، کافکا جو جدید افسانے کا لبِ لباب ہے۔۔۔ کافکا مجھے اس عہد کی مرکزی فنی دستاویز معلوم ہوتا ہے۔'' (ص:۵۶ تا ۵۷) اور پھر یہ کہ ''اُس کی وصیت کی خلاف ورزی کا خمیازہ جدید افسانہ ہے۔ کافکا کی بے چین اور درد آشنا روح کی دی ہوئی بد دعا ہے جدید افسانہ۔'' (ص:۵۷) علاوہ بریں یہ کہ کافکا جسے کسی خالق کا یقین نہیں تھا تو ''ایک بے عقیدہ شخص کی دعا جدید افسانہ بن جاتی ہے۔ اس دنیا کا افسانہ جو بدل گئی ہے۔'' (ص:۶۷) ''کافکا کے روزنامچوں اور افسانوں سے مترشح ہے کہ جدید افسانے کا خمیر دروں بینی سے اُٹھتا ہے، مگر یہ دروں بینی بے سمت اور بے ہیئت نہیں۔'' (ص:۶۳) اور آخر میں آصف فرخی لکھتے ہیں ''کافکا نے ایک مقولہ اس طور لکھا: 'ایک پنجرہ پرندے کی تلاش میں نکلا۔' مقولہ کیا ہے اپنی جگہ مکمل افسانہ ہے۔ پرندے کی تلاش میں نکلا ہوا یہ پنجرہ جدید افسانہ ہے۔'' (ص:۶۷)

یوں آصف فرخی جدید افسانے کے سب تار کافکا سے جوڑ کر اُس کی شعریات مرتب کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جدید فکشن کے خدوخال وضع کرنے میں کافکا کا بہت ہاتھ ہے لیکن کیا صرف کافکا؟ دائرہ انتہائی محدود بھی رکھیں اور نظر کم سے کم بھی دوڑائیں تو کافکا کے علاوہ کامیو، سیموئل بیکٹ، یوجین آیونسکو، سارتر اور بورخیس جیسے ادیبوں سے نظریں چُرانا اور بچ کے نکلنا میرے لیے تو ممکن نہیں۔ اور ایک اور سوال، کہ کیا واقعی جدید افسانہ کافکا کی وصیت کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے؟ کیا یہ آصف فرخی کا تاثراتی بیان نہیں؟ کیا یہ درست ہے کہ اگر کافکا کی وصیت کے مطابق میکس براڈ اُس کی تخلیقات ضائع کر دیتا تو دنیا جدید افسانے سے محروم رہ جاتی؟ میرے خیال سے ایسا نہیں ہے۔ اصل میں جدید افسانہ یا فکشن اُس جدید انسانی صورتِ حال اور سماج کا نتیجہ ہے جس میں کافکا یا کامیو یا آیونسکو یا سارتر جیسے ادیب سانس لے رہے تھے۔ ان ادیبوں نے اگر جدید افسانے کی صورت وضع کی تھی تو جدید انسانی سماج نے ان ادیبوں کو سینچا تھا۔ جدید انسانی سماج نے جب اس دنیا کے افراد کے سامنے وجودی تنہائی، اکیلا پن، خوف، کرب، انتخاب اور سب سے بڑھ کر کائنات کے مقابل اپنے وجود کی معنویت تلاش کرنے جیسے چیلنجز لا کھڑے کیے تو جدید افسانے کی بنیاد پڑی۔ لہٰذا کافکا کی وصیت پوری ہو بھی جاتی تو جدید افسانہ ظہور میں ضرور آتا۔ یہ الگ بات کہ ہماری اس بات سے کافکا کی اہمیت کم نہیں ہوتی، کیوں کہ وصیت پوری ہو جانے کی صورت میں ہم جدید افسانے کے کچھ ایسے پہلوؤں سے شاید ضرور نا آشنا رہتے جو بہر حال کافکا ہی سے مخصوص ہیں۔

افسانے سے متعلق کچھ اہم باتیں آصف فرخی نے اپنے ایک مختصر سے مضمون ''باتوں سے افسانے تک'' میں بھی کی ہیں۔ اس میں خوش ونت سنگھ کے پیش کردہ افسانہ نگاری کے بارے میں روایتی قسم کے اصول وضوابط کی بنیاد پر افسانے کی صنف پر آصف فرخی

نے اظہارِ خیال کیا ہے جس میں طنزیہ اسلوب کی آمیزش بھی ہے۔ مختصر افسانہ کے ساتھ الفاظ کی حد اب بھی مقرر کی جاتی ہے، خوش ونت سنگھ نے بھی ساڑھے تین ہزار الفاظ کی حد متعین کی ہے۔ آصف فرخی اس ذیل میں بڑا واضح مؤقف رکھتے ہیں کہ ''الفاظ کی کوئی تعداد مقرر کر دینے سے افسانے کی صنفی تعریف کا اہم تر مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ کن خصوصیات کی بنیاد پر افسانے کو کہانی کا ایک واضح روپ سمجھا جاتا ہے اور طویل بیانیہ سے ممتاز و ممیز کیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس امتیاز کی بنیاد محض حجم پر نہیں رکھی جا سکتی۔'' (ص:۵۰) اسی طرح آصف فرخی افسانے میں کردار اور واقعات کے اُس طرح لازم و ملزوم ہونے کو ضروری خیال نہیں کرتے جس طرح روایتی تعریفوں میں ضروری قرار دیا گیا ہے۔ کردار نگاری اور واقعات کے بیان کی متنوع صورتیں اور طریقے ہو سکتے ہیں جن کا انتخاب اور استعمال افسانہ نگاروں کی صواب دید پر ہے۔ آصف فرخی کو ''کلّیہ سازی، مردہ گھوڑے کی کھال میں بھُس بھرنے کا عمل معلوم ہوتی ہے۔'' (ص:۵۱) اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ ''ایک صنف کے طور پر افسانے کی کامیابی قاعدے اور اصول سے بے نیاز resilience میں مضمر ہے۔'' (ص:۵۲) آخر میں وہ اس غلط فہمی کو بھی دُور کرتے ہیں کہ شاید افسانہ لکھنا کوئی بہت آسان سا کام ہے۔ اس ذیل میں خوش ونت سنگھ سے زیادہ ہمارے ہاں غلام عباس قصور وار ہیں جنھوں نے بڑے آرام سے کہہ دیا تھا کہ جو شخص اپنے کسی عزیز کو خط لکھ سکتا ہے وہ ذرا سی کوشش سے افسانہ بھی لکھ سکتا ہے۔ اس پر بات کرتے ہوئے آصف فرخی نے بہت عمدہ جملہ لکھا ہے کہ ''بشارتیں ڈاکیے کی طرح دروازے پر دستک نہیں دیتیں اور معجزے خط کے لفافوں میں بند ہو کر نہیں آتے؛ ان کے حصول کے لیے اہتمام کرنا پڑتا ہے۔'' (ص:۵۳) اور یہ ''اہتمام'' کوئی ایسا معمولی کام نہیں کہ اُس عہد میں ہر خط لکھنے والا اور آج کے عہد میں سیل فون پر رومن رسم الخط میں میسج کرنے والا ہر شخص کر سکتا ہو۔

اگر ہم داستان کی صنف کی بات کریں تو اس میں شک نہیں کہ ناول کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے ہمارے افسانوی ناقدین نے داستانوی ادب کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ یوں بھی جب سے حقیقت نگاری و واقعیت نگاری کے کچے پکے تصورات کا چلن عام ہُوا اور اِن تصورات و نظریات کو ناول ہی کا لازمہ سمجھا جانے لگا تو داستانوی ادب کے بارے میں ہمارے رویے کافی سخت ہو گئے۔ آصف فرخی اس پر بھی کافی نالاں ہیں؛ کہتے ہیں ''سب سے زیادہ مشکل اس وقت ہوتی ہے جب داستانوں کو ناول کا نقشِ اوّلین یا ابتدائی اور خام صورت سمجھ لیا جاتا ہے۔ کسی نے رجب علی بیگ سرور کے 'فسانۂ عجائب' کو داستان اور ناول کی درمیانی کڑی قرار دیا ہے۔'' علاوہ ازیں یہ کہ ''داستان میں ناول کا پیش خیمہ تلاش کرنے والوں کے ذہن میں ایک اور تصور جاگزیں ہے، اور وہ یہ ہے کہ داستان، تہذیب کے اوائلی ایام یا ابتدا کی نمائندگی کرتی ہے، جب کہ ناول و افسانہ تہذیب کے بلوغ اور جدیدیت کے علم بردار ہیں۔'' (ص:۱۸۰)

اصل میں آج داستانوں کی تفہیم کا نیا پس منظر ایک طرف جارج فریزر اور لیوی اسٹراس کی تحقیقات سے قائم ہوتا ہے تو دوسری طرف تھیوری اور بیانیات کے مباحث سے اسے تقویت ملتی ہے۔ اُردو میں کلیم الدین احمد اور اُس کے بعد خاص طور پر ڈاکٹر سہیل

احمد خان اور شمس الرحمن فاروقی نے جو اُردو داستانوں کے حوالے سے نیا ڈسکورس قائم کیا ہے، آصف فرخی اُن سب سے روشنی لیتے ہیں اسی لیے اُن کا مؤقف اُن ناقدین سے علیحدہ ہے جو داستان کو ناول کے تناظر یا شعریات کی بنیاد پر پرکھتے ہیں اور پھر اس بنیاد پر داستان کو ایک ٹھس، جامد اور بڑی حد تک بے کار صنف سمجھنے کا رجحان عام کرتے ہیں۔ آصف فرخی داستان کی معنویت ایک بالکل الگ صنف کے طور پر قائم کرنے اور اُس کی اپنی کائنات دریافت کرنے کے حق میں ہیں اور یہ تبھی ممکن ہے جب ہم داستان کو اُس کی اپنی شعریات یا قواعد کے تحت سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اسی لیے وہ اُردو میں اس ذیل میں شمس الرحمن فاروقی کے کام کو بہت سراہتے ہیں۔

داستانوں کے حوالے سے آصف فرخی کے نظریات اور مباحث ہمیں اس کتاب کے تین مضامین میں نظر آتے ہیں۔ ایک تو ''حیرتی ہے یہ آئینہ'' جو اس کتاب کا سب سے طویل مضمون ہے اور اس میں انیسویں صدی کے نظر انداز کیے گئے اُردو ناولوں خاص طور پر ''نشتر'' پر اچھی خاصی تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کی بحث ملتی ہے؛ اس کے ساتھ ساتھ داستان اور ناول کے تقابل کی بحث اور اُردو ناقدین کا اس میں کردار اور پھر اُردو ناول کی اہمیت اور اُس کی شعریات پر مباحث۔ (اس مضمون میں باختن کے نظریات سے کافی استفادہ کیا گیا ہے)۔ دوسرا مضمون ''عالمِ ایجاد'' ہے جس کی بنیاد پر کتاب کا بھی عنوان ہے۔ اس میں بھی ہمیں داستان سے متعلق مباحث ملتے ہیں اور ایک ابتدائی مضمون ہے ''بندر کی تقریر'' جو فسانۂ عجائب'' کے رشید حسن خان کے مرتبہ متن کے حوالے سے ہے۔

ناول کے حوالے سے بھی آصف فرخی بہت سی منطقی (اور کچھ تاثراتی) انداز کی اہم باتیں کرتے ہیں۔ سب سے پہلے منٹو کے کتبے کو موضوع بناتے ہوئے، جس پر لکھا ہُوا ہے کہ ''وہ (منٹو) بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا''؛ وہ ہمیں یہ کہہ کر چونکاتے ہیں کہ منٹو بڑا افسانہ نگار ہے: ''منٹو اس لیے بڑا ہے کہ خدا افسانہ نگار ہی نہیں۔۔۔ خدا تو ناول نگار ہے۔'' (ص:۱۳۴) اس بیان سے وہ افسانہ نگاری اور ناول نگاری کا فرق واضح کرتے ہیں۔ ''زندگی کے تمام تار و پود، جزئیات و تعلقات کی بھرمار اور تفصیل در تفصیل کے لحاظ سے، جو افسانے کے چند لمحات پر مشتمل heightened tension اور 'جھلکیوں' کے بہ قدرِ ظرف نہیں، دیکھا جائے تو کسی اور صنف کے بجائے خدا ناول کی تخلیق پر عمل پیرا ہے۔ اور یہ بھی بالکل نمایاں ہے کہ خدا، فلوبیئر کے دبستان کا ناول نگار ہے۔'' (ص:۱۳۵) فلوبیئر جس نے کہا تھا کہ افسانہ ساز اپنی تخلیق میں خدا کی طرح ہو کہ ہر جگہ موجود رہے پھر بھی کہیں دکھائی نہ دے۔

بنیادی طور پر اپنے اس تفصیلی مضمون میں آصف فرخی ''افسانہ طرازی یا سازی'' کے حوالے سے مشترک باتیں کرتے ہیں جس سے اُن کی مراد مختصر افسانہ، ناول اور داستان؛ تینوں ہیں۔ ''حیرتی ہے یہ آئینہ'' میں آصف فرخی ناول پر باختن کے نظریات کے

تحت بات کرتے ہیں، بالخصوص اُردو ناول پر اور وہ بھی انیسویں صدی کے اُس ناول پر جس پر ہمارے ناقدین نے بہت کم توجہ دی یا بالکل توجہ نہیں دی۔

اُردو ناول سے متعلق آصف فرخی کے چند سوالات بڑے غور طلب ہیں۔ مثلاً ''کیا اُردو میں ناول کے آغاز اور ہندوستان میں صنعتی دَور کے آغاز کا زمانہ ایک ہی ہے، اور کیا ان میں علت و معلول کا تعلق ہے؟ اگر اس سوال کا جواب آپ ہاں میں دیتے ہیں تب بھی اس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ داستان اور ناول میں جو فرق ہے کیا وہ دنیا کے بارے میں نقطۂ نظر (World View) اور اس کے فنی اظہار کا فرق ہے؟ اور اگر یہ فرق دونوں کے نفسِ مضمون (Sjuzet) یا طریقۂ بیاں واردات میں بھی موجود ہے تو آخر میں کس مقام پر واقع (Precisely Located) ہے؟ صنعتی دَور یا جاگیر داری کی تفریق ان اہم تر سوالوں کے ضمن میں ہمارے لیے کچھ خاص معاون ثابت نہیں ہوتی۔'' (ص:۱۸۷)

باختن کے تصورات سے استفادہ کرتے ہوئے آصف فرخی یہ نتیجہ نکالنے میں کامیاب رہے کہ ''مصنف کا نقطۂ نظر اور world view جب آئیڈیالوجی بن کر حاوی ہو جائیں تو ایک بار پھر ناول کا مکالماتی امکان، اور ایک ہی متن میں مختلف نقطہ ہائے نظر اور مختلف اسالیب کی موجودگی مفقود ہونے لگتی ہے۔'' (ص:۱۹۴) بہر حال ناول، ناول اور داستان میں فرق اور انیسویں صدی کے اُردو ناول کا باختنی نظریات کے تحت مطالعہ اس مضمون کو خاصے کی چیز بناتا ہے جس کی مثال اُردو فکشن کی تنقید میں ابھی بھی کم کم نظر آتی ہے۔

ناول یا فکشن میں تجربے کی بحث کو آصف فرخی نے اپنے مضمون ''تجربہ اور تخیل'' میں اُٹھایا ہے۔ اس مضمون کا بنیادی سروکار تو اُردو کی اُس تنقید کا جواب دینا ہے جو قرۃ العین حیدر کے فکشن میں اُن کے کچھ سوانحی حوالوں کی وجہ سے ادھورے تجربے کا الزام عائد کرتی ہے، یا شعور کی رَو کے استعمال پر سوال اُٹھاتی ہے۔ اور اسی سارے معاملے سے ہمیں ناول میں تخلیق کار کے سوانحی پہلو یا تجربے کی نوعیت اور اُس کی ماہیت کے حوالے سے اور تکنیک یا تخیل کے عمل دخل سے متعلق چند اہم نقاط مل جاتے ہیں۔ مثلاً سب سے پہلے تو آصف فرخی یہ واضح کر دیتے ہیں کہ ''افسانہ سازی کا کام خاتون کر رہی ہو یا مرد، اس کی نجی زندگی کی ایسی تمام تفصیلات لازمی نہیں کہ اُس کے ادبی مطالعے میں معاون ثابت ہوں۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو یہ تفصیلات رکاوٹ بن جاتی ہیں کہ ناقد پھر ان کی تاویلات میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔'' (ص:۴۷) اس ذیل میں آصف فرخی فرانسیسی ادیب پروست کے نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ ''سوانح کی بھرمار اس عنصر کی گنجائش نہیں چھوڑتی جسے اُس (پروست) نے Moi Profound کا نام دیا، اور یہ شخصیت کی گہرائی یا ذات عمیق وہ تخلیقی روح ہے جو باطن کی پہنائیوں سے اُبھر کر آتی ہے۔ پروست کے لیے تقلیب (Transformation) کا وہ عمل بنیادی حیثیت رکھتا ہے جس کی مدد سے ادیب اپنے تجربے کو 'ادبِ عالیہ' میں ڈھال دیتا ہے۔'' (ص:۴۷) اور پھر آخری نتیجہ یہ کہ ''ضروری نہیں کہ جذبات و تجربات کی پوری سرگم ناول نگار کی دست رس

میں ہو۔ یہ امر زیادہ توجہ طلب ہے کہ وہ تجربے کو کس طرح بروئے کار لاتا ہے، اُس نے تجربے سے تخلیقی بصیرت تک پہنچنے کی نہج کیا اختیار کی ہے۔"(ص:۷۹) اور اس میں سب سے زیادہ کام آنے والی شے، تخلیق کار کی قوتِ متخیلہ ہے۔ اسی لیے آصف فرخی کے بقول "اسی قوت (متخیلہ) کے سہارے وہ نہ صرف تجربے کی کمی کو پورا کر سکتا ہے بلکہ اُن مراحل سے بھی گزر سکتا ہے جن سے وہ فی الواقع نہیں گزرا اور نادیدہ بلکہ ناآفریدہ جہانوں کی سیر کر سکتا ہے۔"(ص:۸۰) ایک اہم اور بحث طلب بات تکنیک کے حوالے سے کہ "کوئی بھی تکنیک Strait Jacket نہیں ہوتی کہ اُس کے اندر بندھ کر مصنف ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکے۔۔۔ بلکہ تخلیقی مصنف تکنیک کو اپنے مقاصد کے تابع لا کر اُسے ڈھال سکتا ہے۔"(ص:۷۷)

غرض یہ کہ آصف فرخی کی افسانوی تنقید کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس ضمن میں اُن کے مطالعے اور غور و فکر کا دائرہ وسیع ہی نہیں، عمیق بھی ہے۔ گو اختلافات کی گنجائشیں موجود ہیں (اور وہ کہاں نہیں ہوتیں) لیکن اصل بات یہ ہے کہ اُنھوں نے فکشن کی تنقید کو معاصر مباحث سے جوڑ کر اُردو کی افسانوی تنقید کا دامن وسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے اُنھیں اُردو کی روایتی افسانوی تنقید سے بھی مجادلہ کرنا پڑا ہے جس کی ایک واضح مثال تو اُن کا مضمون "نقاد بہ طور دشمن" ہے لیکن یہ مجادلہ صرف اسی مضمون تک محدود نہیں بلکہ یہ تمام مضامین میں موجود ہے۔ اس حوالے سے بھی جہاں بہت زیادہ داد بنتی ہے وہاں بہت سارے اختلافات جنم لیتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اس مجادلے میں بھی نئے نئے سوالات ہمارے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں۔ ان سے بھی کسی اور وقت معاملہ کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں آصف فرخی نے غالب کی تخلیقات کا افسانہ طرازی سے جو رشتہ جوڑا ہے، وہ بھی ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آصف فرخی کی تنقید جس کا دورانیہ لگ بھگ تیس سال پر مبنی ہے (جب کہ یہاں اُن کی بہ مشکل دو سال پر مبنی تنقید بحث کا حصہ بنی ہے)، مغربی ادب اور اُردو کے جدید اور کلاسیک ادب کے مطالعے کے امتزاج کا مرقع ہے؛ مغربی اور اُردو ادب سے استفادے میں جو فکری اور نظری توازن ہے کہ نہ تو کسی احساسِ کم تری کا شائبہ ہے نہ ہی کسی طرح کا احساسِ برتری کم نظری پیدا کرتا ہے؛ اُس نے آصف فرخی کی تنقید کو ایک ایسا وقار بخشا ہے جو تنقید میں کم کم دکھائی دیتا ہے۔

☆☆☆

اردو شاعری میں مغربی تہذیب کا تذکرہ

ڈاکٹر عبدالمنان چیمہ

برصغیر پاک وہند میں اسلامی تہذیب وتمدن رائج میں اردو زبان وادب نے جان دار اور شان دار کردار ادا کیا۔ آج کل پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا ہمارے معاشرے میں مغربی تہذیب وتمدن سرایت کرنے میں کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔ یہ بات عیاں ہے کہ ٹی وی، انٹرنیٹ، موبائل استعمال کرنے کے بعد نماز، روزہ اور دین اسلام کی طرف رجحان کم اور شیطان کی طرف زیادہ ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ فارغ اوقات میں قرآن وحدیث کے مطالعہ کی بجائے فلم دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ مغربی تہذیب وتمدن کی مصنوعی روشنیوں نے مسلمانوں کی نوجوان نسل کے ایمان کو راکھ کر دیا ہے۔ مغربی تہذیب کے پھیلاؤ نے نوجوان کی سوچ کو کیمو فلاج کر دیا ہے۔ اسلام کسی ایسی تہذیب وثقافت اپنانے کی اجازت نہیں دیتا جو معاشرے میں فساد کا باعث ہو۔ معاشرہ میں مغربی تہذیب کا قلع قمع کرنا وقت کی پکار ہے۔ عصر حاضر میں اسلام پر عمل پیرا ہو کر مغربی تہذیبی وثقافتی یلغار کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ مغربی تہذیب وتمدن کا اثر ونفوذ سب کے سامنے ہے۔ ہمارے معاشرے میں معاشی وسماجی نظام کا عدم استحکام سے دوچار ہونا اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

ہمارے ملک میں انگزیری زبان وادب اور مغربی تہذیب کا اثر ونفوذ بڑھتا جارہا ہے۔ اردو زبان پاکستان کی قومی زبان ہے جس نے جنوبی ایشیا میں اسلام کی اشاعت وتبلیغ میں جاندار کردار ادا کیا ہے۔ اردو زبان وادب کے فروغ سے مغربی طرزِ حیات کے بڑھتے ہوئے رجحان کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں مغربی تہذیب وثقافت کو قابل قبول بنایا جارہا ہے حالانکہ مغربی تہذیب وثقافت معاشرتی وسماجی اعتبار سے کھوکھلی اور ناپائیدار ہے۔ اردو ادب کے بہت سے مشاہیر اور شعراء نے مغربی تہذیب کی سماجی تباہ کاریوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنانا خوش آئند ہے۔

امینِ حزیں سیالکوٹی مغربی تہذیب کے شدید مخالف تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلمان اسلامی تہذیب وثقافت اپنائیں تاکہ دونوں جہانوں میں کامیاب وکامران ہو سکیں۔ امینِ حزیں اپنی شاعری میں جگہ جگہ تہذیبِ مغرب کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

تہذیبِ فرنگ ہے سکوں سوز
اللہ اس آگ سے بچائے !
بد بخت بلا کی ہے بد آموز
اس کا نہ کوئی فریب کھائے !

ہر لمحہ عزیز اپنا ہی سود!
ہر لحظہ مفادِ خویش در پیش!
ہر وقت زباں پہ مدح اپنی
تہذیبِ فرنگ ہے "عدو کیش"
بد بخت ہے خود غرض بلا کی
اسلام ہدف ہے "ناسزا" کا
یہ چاہتی ہے۔ یہی نعوذ باللہ
مٹ جائے جہاں سے گھر خدا کا

مولانا ظفر علی خان اپنی شاعری میں مغربی تہذیب کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔ وہ قادیانیوں کو مغربی تہذیب کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں ۔اس حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

حقیقت قادیاں کی پوچھ لیجئے ابنِ جوزی سے
نکو کاری کے پردے میں سیہ کاری کا حیلا ہے

یہ وہ تلبیس ہے ابلیس کو خود ناز ہے جس پر
مسلمان کو اس رندے نے اچھی طرح چھیلا ہے

پلی ہے مغربی تہذیب کی آغوش عشرت میں
نبوت بھی رسیلی ہے پیغمبر بھی رسیلا ہے

آغا وفا مسلمانوں کے سامنے مسلم تہذیب و تمدن کے سنہری دور کو پیش کرتے ہیں اور اسلامی تہذیب ہر لحاظ سے غالب تھی۔ مگر آج مغربی تہذیب و تمدن کی چمک دھمک نے انھیں مغربی تہذیب کا دلدادہ بنا دیا ہے۔ مسلم امہ

مغرب کے سامنے معذرت خوانہ رویہ اپنائے ہوئے ہے۔ آغا وفا مسلمانوں کے اس کربناک حالت پر اظہار افسوس کرتے دکھائی دیتے ہیں: اس حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

دھوم تھی جن کی کشور کشائی کی وفا
ان کے ہاتھوں میں ہے اٹیم بم کے بدلے اب غلیل

اک قدم اپنی مرضی سے اٹھا سکتے نہیں
دستِ امریکہ میں ہے مسلم ممالک کی نکیل

علامہ اقبال عظیم حکیم الامت اور عظیم مسلم مفکر ہیں۔ اقبالؒ جہاں اسلامی تہذیب کے درخشاں پہلو اجاگر کرتے ہیں وہیں مغربی تہذیب کے عیوب و معائب کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ اقبالؒ کی شاعری کا بڑا ہدف مغربی تہذیب و ثقافت ہے۔ اقبال کی شاعری کا بڑا حصہ مغربی تہذیب پر تنقید پر مشتمل ہے۔

اس حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

حقیقتوں پہ ہے مبنی یہ بات اے اقبال
ملی ہے مغربی تہذیب میں ہمیں تو پناہ

حدیث ساغر و مینا ہو جب متاعِ حیات
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

ہمارا دل نہ کیوں تہذیب نو سے روشنی لیتا
نئی تعلیم سے آنکھیں چُرا لینا تھا نادانی

نہ کیوں دل جلوہ افرنگ سے مسحور ہو جاتے

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

تم نے دیکھا نہیں یورپ کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندرون چنگیز سے تاریک تر

ناول "دھنی بخش کے بیٹے" میں خیر و شر کا تصور

کومل شہزادی

اس کائنات میں ازل سے "خیر" اور "شر" کی کشمکش ہے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہی کشمکش آپ کو ایسے تصورات کے اطلاق کی راہ میں بھی حائل نظر آتی ہے۔ اس کائنات میں "خیر" اور "شر" مابعد طبعیاتی اور ماورائی تصورات ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو انسان دو طرح کے عوامل کے زیر اثر ہوتا ہے ایک خیر اور دوسرا شر - کچھ چیزیں خیر کا اظہار ہوتی ہیں اور کچھ شر سے جنم لیتی ہیں۔

اس پر ایک طویل بحث کی جاسکتی ہے مگر میں ناول "دھنی بخش کے بیٹے" کی بات کروں تو ناول نگار نے دو الگ کرداروں کے ذریعے اس موضوع کا احاطہ کیا ہے۔ حسن منظر ایک منفرد ناول نگار ہیں اور ان کا یہ ناول اکیسویں صدی کا عمدہ ناول کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ ناول میں دو کردار علی بخش اور احمد بخش سے خیر و شر کی کشمکش کا پہلو ہے اس کو دونوں کرداروں سے عمدہ انداز میں بیان کیا ہے۔ علی بخش کے کردار میں شر جیسے عناصر پائے جاتے ہیں جبکہ احمد بخش کے کردار میں ہمیں خیر کے پہلو ملتے ہیں۔ ناول نگار نے دونوں کی عادات واطوار سے اس تصور کو ناول میں جگہ جگہ تذکرہ کیا ہے۔ خیر و شر پہلوؤں کا بھی بہت خوب انداز میں نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جس سے ناول کے دو کردار علی بخش اور احمد بخش سے عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ دھنی بخش کے گاؤں اور اس کے ارد گرد دیہاتوں میں یہ خبر گردش ہونا شروع ہو جاتی ہے کہ احمد بخش امریکہ جا رہا ہے۔ احمد بخش کو ایسی برائیوں سے بڑھے ہوئے ماحول سے کراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ وہ کلچرل سسٹم میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اسے یہاں کے رہن سہن سے نفرت محسوس ہوتی تھی۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد امریکہ چلا جاتا ہے۔ وہاں شادی بھی کر لیتا ہے۔ امریکہ میں کچھ سال رہنے کے بعد اس کو وہاں بھی اجنبیت سی محسوس ہونے لگی۔ جبکہ امریکہ روانہ ہونے سے پہلے بھی اس کے دماغ میں ایسی باتیں تھی کہ وہ اس گندگی اور بے اصولی سے تنگ آکر بھاگ رہا ہے۔ اور خود کو مطمئن کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "مجھے یہاں ایک دن لوٹ کر آنا ہے، مجھ میں لوٹ کر آنے کی خواہش ہے۔۔۔۔ بھاگتا انسان جیل سے ہے جب وہ اپنے دماغ میں وہاں دوبارہ نہ آنے کا جتن کر کے بھاگتا ہے۔" احمد بخش دنیا دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے اور وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کیا باہر کی دنیا ویسی ہی رنگین ہے جیسے وہ فلموں میں نظر آتی ہے۔ یہاں اُسے وقتی طور پر اجاڑ اور حسن سے عاری ہی سب کچھ نظر آرہا تھا۔ لیکن امریکہ کی دنیا میں چند سال گزارنے کے بعد اسے یہ خیال آتا ہے کہ اسے واپس جانا چاہیے۔ اور یہ عزم کرتا نظر آتا ہے کہ وہ سارے ملک کو بہتر نہ کر سکے لیکن اپنے علاقے کو تو بہتر کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ لیکن علی بخش اس کے امریکہ رہنے پر خوش تھا کہ وہ ادھر سب زمینوں کا ایک اکیلا مالک ہے۔ احمد بخش کو مغربی تہذیب میں یہ خدشہ ہونے لگا کہ اس کی اولاد جنسی تعلیم کی جانب مائل نہ ہو جائے۔ برائیاں تو پاکستان میں بھی ہیں لیکن کھلے عام نہیں جیسے امریکہ میں تھا۔ جس کو ناول میں مصنف اس طرح تذکرہ کر رہا ہے۔

"میں صرف زمین کے ایک چھوٹے ٹکڑے کی زندگی کو بدلنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے وہاں لوگوں میں رہنا پڑے گا۔ ان میں رہتے ہوئے خود کو بدلوں گا جس طرح میں چاہتا ہوں وہ بدل جائیں۔"

احمد بخش کی اولاد ہوتی ہے تو وہ اس کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے کہ اس کی بیٹی بوائے فرینڈ نہ بنالے کیونکہ امریکہ میں یہ سب عام رواج میں شامل تھا۔ اور بیٹے کے متعلق اسے خوف ہوتا ہے کہ وہ کہیں شراب اور دوسری بری علت میں مبتلا نہ ہو جائے کیونکہ یہاں تعلیمی اداروں میں جنسی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اولا جو اس کی زوجہ ہے جو احمد بخش کو تسلی دیتی ہے کہ تم بھی تو یہاں رہ رہے ہو اور یہاں سے تعلیم بھی حاصل کر چکے ہو لیکن تم تو کسی برائی میں مبتلا نہیں ہوئے اور نہ تم شراب پیتے ہو۔ اسی طرح ضروری نہیں کہ ادھر رہنے والے سب ایک جیسے ہو جائیں۔ جبکہ احمد بخش کا کہنا ہے کہ میں نے پرورش اور نوجوانی کے دن دیہات میں گزارے ہیں ۔ میں چھوٹے سے بالغ ہونے تک وہیں رہا ہوں۔ لیکن میری اولاد تو بچپن بھی ادھر ہی ہے۔ مجھے یہ ہی خدشہ ہے کہ میری اولاد میں یہاں کی برائیاں نہ پائی جائیں۔ جبکہ میرے علاقے میں کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا جیسے یہاں کے نابالغ بچے کرتے ہیں اور اُن کی طبیعت میں یہ سب کچھ رچ جاتا ہے "امریکا جذبات کا ویرانہ ہے۔ چین اور تمہارے ملک اخوت کے سمندر ہیں، جن میں کوئی خود کو گم نہیں کر سکتا۔ لاکھ ہاتھ چھڑاؤ کوئی نہ کوئی پکڑ لے گا۔ احمد بخش ڈرتا تھا اُس ماحول سے جو اُس کے بچوں کا ذہنی مستقبل کیا ہو گا ۔ دوسری طرف بچوں کی پیدائش کے بعد احمد بخش کو گھر کے اور بچوں کو سنبھالنے کے کام خود ہی کرنے پڑ رہے تھے۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ امریکہ میں رہنے کے باوجود بھی اپنی زوجہ کو اہمیت اور نگہداشت کس طرز پر کر رہا تھا دوسری جانب علی بخش جو بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھتا تھا۔ علی بخش مردوں کی اس قسم میں سے تھا جو گھر میں بیوی کے ہوتے ہوئے بھی بازار میں ایک محدود مدت کے لیے ایک لڑکی کو خریدتے ہیں، چاہتے ہیں کہ ان کا دلال بار بار یقین دلائے کہ تم اس کی زندگی میں پہلے مرد ہو لیکن پھر بھی معاملہ دھوکے والا رہتا ہے۔ ان کا دل اس بات پر آمادہ ہی نہیں ہوتا کہ جو چیز انہوں نے خریدی ہے وہ استعمال شدہ نہیں ہے۔

"مرد کو ہر حالت میں عورت چاہیے ہوتی ہے وہ اپنی ہو یا غیر کی اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی بخش کی سوچ عورتوں کے سلسلے میں کیسی ہے۔ یہ عورتوں کا شیدائی تھا۔ علی بخش کے کردار میں تمام برائی والی علامات موجود تھیں اس کے کردار میں شر والے عناصر اور تقریباً تمام ایسی عادات ملتی ہیں جو شر کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ اگر کوئی دعوت یا تقریب ہوتی تو اُس میں شراب اور وسکی لازم رکھی جاتی ہے۔ علی بخش خود کو خدا صفت انسان سمجھتا تھا مریم کے ساتھ اس کی ظلم و زیادتی جس کو وہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ وہ دوسروں پر استحصال کرنا اپنا حق سمجھتا تھا۔ جو اپنی بیوی مریم سے بھی کہتا ہے کہ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے بلکہ وہ اس کی بیوی ہے اور وہ اس کو اپنی مردانگی سمجھتا ہے۔ اور مریم قانونی طور پر اس کی بیوی ہے۔ علی بخش اپنے آپ کو اس طرح مطمئن کرتے ہوئے ناول میں نظر آتا ہے۔

"۔۔نہ تونے مردوں کا ساکام کیا ہے مجھے تجھ پر فخر ہے۔

"جرم کیا ہے؟"

نہیں اپنی گھر والی ہے۔ تیری ملکیت۔"جرم کیسا؟"

علی بخش کی سوچ اُن مردوں جیسی ہے جو بیوی کو غلام سمجھتے ہیں اور ان پر آقا کی طرح اپنا حکم صادر کرتے نظر آتے ہین۔ دیہی قصبوں میں ابھی بھی علی بخش جیسے مرد موجود ہیں۔ جو بیوی کو انسان نہیں سمجھتے۔ اپنا رعب رکھنا درست سمجھتے یں۔ بیوی کے ساتھ غلط رویے کو بھی درست قرار دیتے ہیں۔ ان پر ذہنی، جسمانی اور مالی تشدد کرنا بھی ان کے نزدیک درست عمل ہوتا ہے۔۔"دھنی بخش کے بیٹے" میں تمام کردار نشے کی لت میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ محض احمد بخش کا کردار اس برائی سے پاک نظر آتا ہے۔ باقی ناول میں تمام خواتین بھی نشے کی لت میں لگی ہوتی ہیں۔ اس کی بہترین عکاسی علی بخش کے کردار کے ذریعے حسن منظر نے کی ہے۔ علی بخش کا کردار ایسا ہے جس میں ہر قسم کی برائی دیکھی جاسکتی ہے۔ علی بخش کچھ نشے حرمت جو اس کی پہلی بیوی اس سے شادی سے پہلے کرتا تھا اور کچھ اس کے آنے کے بعد کرنے شروع کیے۔ جب تک اس کے پانچ چھ سال بعد دوسری شادی کی نوبت آئی تو یہ تمام بڑے نشے کر چکا تھا۔ شراب ایک سوایک شکلوں میں وہ پیٹ بھر کر پی چکا تھا۔ ان میں کوہلی وسکی بھی تھی یعنی ٹھراجو سڑے ہوئے پھلوں سے گاؤں میں بنتی تھی۔ اور نشئی غریبوں کی غم گسار ہوتی تھی۔ اسکوچ، بھنگ، چرس، افیون، ہیروئن اور مختلف گولیاں ہر چیز اس کی ساتھی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ جلدی میں ہے اور کوئی نشہ دنیا چھوڑنے سے پہلے رہ نہ جائے اور دوسری دنیا میں اس کی طلب ہو۔ اگر کبھی خبر ملتی تھی فلاں ملنے والا یا دوست نشے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے زندگی کو داگ مفارقت دے گیا۔ لیکن علی بخش کے کردار میں وہ تمام برائیاں تھیں جو جاگیر دار میں پائی جاتیں ہیں۔

"وہ اکثر مزاروں سے نشہ کر کے لوٹتا تھا اور حشر کے چالیسویں تک بنگلے میں غم زدہ سا پڑا رہتا تھا۔"

احمد بخش کا کردار واحد ایسا ہے جو ایسی کسی بھی چیز کو پسند نہیں کرتا تھا۔ بلکہ وہ حرمت سے اس حوالے سے ناپسندیدگی کا اظہار کرتا تھا۔ حرمت کے منہ سے سیگریٹ کی بو اسے پسند نہیں تھی۔

"گھر کی سب عورتوں کی طرح حرمت بھی سیگریٹ پیتی تھی اور اس کی ڈبیا اور ماچس اس کے کرتے کی جیب میں رہتی تھیں۔"

علاوہ ازیں علی بخش اپنا رعب قائم رکھنے کے لیے پاکیزہ چہرہ بھی رکھتا تھا اور ساتھ ہی بدکرداری میں بھی ملوث تھا۔ ایسا ہی جاگیر دار علی بخش کا کردار ہے۔ جو بہت آسانی سے لذت سے روحانی سرشاری اور روحانی سرشاری سے واپس لذت کی دنیا میں جاسکتا تھا بالکل جیسے عرس کے موقعوں پر ہوتا ہے۔ اس کی خوب عکاسی کر کے ناول نگار نے اس پہلو کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے۔

"مزار پر عقیدت سے سر جھکایا اور باہر نکل کر میلے کی مادی لذتوں کی دنیا میں کھو گئے، ناچ گانا، نشہ، اور خیموں میں اجرت پر ملنے والے جسم۔"

اس کے برعکس کردار احمد بخش ایک انقلابی ذہن کا مالک تھا جو اپنے گاؤں میں انقلاب لانے کا خواہش مند تھا۔ وہ ان رویوں اور برائیوں کو بدلنا چاہتا تھا۔ جو تھوڑی سی خواہش اس میں واپس اپنے علاقے میں جانے کی رہ گئی تھی ،وہ بھی اچانک ختم ہو گئی تھی ۔وجوہات وہیں تھیں جن سے وہ بھاگا تھا۔ پرانی یادیں اور تکلیف جو اس میں جگا دیتے تھے۔ وہاں کا رونا، وہاں کے دکھ اور کسی بھی کام کا نہ ہو پانا۔

المختصر ،ناول میں مزید اور بھی پہلو ہیں جن سے خیر و شر کی کشمکش کو نمایاں کیا جا سکتا ہے لیکن مختصر مضمون میں اس کا احاطہ ممکن نہیں تھا۔

ناول "جہنم جاگتا رہتا ہے": تحقیقی و تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر محفوظ احمد ثاقب

سلیم اختر ڈھیرا چنیوٹ سے تعلق رکھنے والے اک نوجوان ادیب ہیں۔ پیشے کے حوالے سے معلم ہیں اور ہائر ایجوکیشن کمیشن میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کا بنیادی مضمون انگریزی ہے تاہم اردو ادب میں خامہ فرسائی ان کا جنونی مشغلہ ہے۔ اس سے قبل بھی موصوف اردو ادب کے افق پر اطالوی لوک کہانیوں پر مشتمل "کہانی آوارہ ہوتی ہے" کی شکل میں کرنیں بکھیر چکے ہیں۔ موصوف کی اس کتاب نے جنگل میں آگ کی سی تیزی کی طرح اپنی مقبولیت کا لوہا منوایا ہے۔ یہ امر قابلِ ستائش ہے کہ اس کتاب پر سینکڑوں تنقیدی نگارشات بھی پیش کی گئیں۔

زیرِ تبصرہ ناول "جہنم جاگتا رہتا ہے" ایک انگریزی ناول "نو لونگر ایٹ ایز" کا ترجمہ ہے۔ یہ انگریزی ناول ایک معروف افریقی ناول نگار چنیوا اچنبے کا ہے جس کو پہلی بار 1960ء میں شائع کیا گیا۔

مترجم سلیم اختر ڈھیرا نے زیرِ نظر ناول "جہنم جاگتا رہتا ہے" کو عکس پبلی کیشنز لاہور سے پہلی بار دسمبر 2022ء میں شائع کروایا۔ یہ ناول غیر مجلد ہے۔ سبز رنگ کے دیدہ زیب ورق کے ساتھ سلور رنگ میں بحرِ فِ جلی "جہنم جاگتا رہتا ہے" کندا کیا گیا ہے۔ کتاب کے سرِ ورق پر کیلی گرافی میں اک نوجوان کی تصویر چسپاں ہے جو دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر انتہائی فکر اور پریشانی میں مبتلا ہے۔ پہلی نظر میں یہ تصویر قاری کو حیرت اور تجسس کے دریا میں برد کر دیتی ہے کہ آخر جہنم کے جاگنے کے ساتھ اس تصویر کا کیا تعلق ہے؟ مگر ناول مکمل پڑھنے کے بعد قاری نہ صرف یہ جاننے میں کامیاب ہو جاتا ہے بلکہ تسلیم کرنے میں بھی حق بجانب ہوتا ہے کہ ٹائٹل کے ساتھ آویزاں یہ تصویر پورے ناول کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ ناول درمیانے سائز کے کل 240 صفحات پر محیط ہے۔ دیدہ زیب اوراق پر نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ طباعت کی گئی ہے۔ مذکورہ ناول پر قیمت مبلغ 1000 روپے رقم ہے۔

ناول کے ٹائٹل پر پڑنے والی پہلی نظر قاری کے ذہن بیسوں سوالات کو جنم دیتی ہے۔ آخر ناول کا عنوان "جہنم جاگتا رہتا ہے ہی کیوں رکھا گیا؟ بھلا جہنم بھی جاگتا ہے؟ اگر جاگتا ہے تو پھر کس لیے جاگتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان سوالات کے جوابات کا انکشاف ناول پڑھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔

ناول میں بیان کی جانے والی کہانی کا موضوع رشوت ستانی ہے۔ ناول پر سیر حاصل بحث کرنے سے قبل ٹائٹل "جہنم جاگتا رہتا ہے" کو واضح کرنا از حد ضروری ہے۔ راقم کے خیال میں جہنم استعارہ ہے پاپی پیٹ کے ہوس، حرص اور لالچ کا۔ انسان فطری طور پر لالچی ہے۔ اس کے نفس میں حرص، طمع، لالچ ودیعت کر دیا گیا ہے۔ یہ لالچ شاید مر کر بھی پورا نہیں ہوتا۔

بقولِ شاعر

انسان کی خواہشوں کی کوئی انتہا نہیں دو گز زمیں بھی چاہیے دو گز کفن کے بعد

زیرِ بحث ناول " جہنم جاگتا رہتا ہے "ناول میں مذکور کہانی / موضوع پر مکمل دلالت کرتا ہے۔ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی قیدی پرندوں کی طرح طمع کے لالچ میں پھنس جاتا ہے پھر ساری زندگی نادم رہتا ہے۔ گویا اس کا جہنم (لالچ) ہمیشہ جاگتا رہتا ہے۔

زیرِ تبصرہ ناول پر بحث کرنے سے قبل اس کی کہانی اور پلاٹ کا سرسری جائزہ لینا از حد ضروری ہے تاکہ ناول کو سمجھنے، پرکھنے اور نتائج اخذ کرنے میں آسانی رہے۔

Things No Ionger at Ease افریقی ریاست نائجریا سے تعلق رکھنے والے مصنف چنیوا اچنبے کا شاہکار ناول ہے۔ اس ناول میں نائجیریا میں پھیلی سیاسی تباہ حالی اور رشوت ستانی جیسی بدعنوانیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ایک ایگبو شخص اوبی اوکونکو ہے، جو برطانیہ میں تعلیم حاصل کرنے اور پھر نائجیریا کی نوآبادیاتی سول سروس میں ملازمت کے لیے اپنا گاؤں چھوڑ دیتا ہے، لیکن اپنی افریقی ثقافت اور مغربی طرز زندگی کے درمیان کشمکش کا شکار ہے۔۔ یہ ناول دوسری تصنیف ہے جسے کبھی کبھی "افریقی تثلیث" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، تھنگز فال اپارٹ اور اس سے پہلے کے ایرو آف گاڈ کے بعد، حالانکہ ٹرولوجی کی عظیم کہانی میں تاریخ کے لحاظ سے خدا کا تیر اس سے پہلے ہے۔ Things Fall Apart برطانویوں کی طرف سے لائی گئی تبدیلیوں کے خلاف اوبی اکونکو کے دادا اوکونکو کی جدوجہد سے متعلق ہے۔

ناول کا آغاز رشوت لینے کے الزام میں اوبی اوکونکو کے مقدمے سے ہوتا ہے۔ اوبی ایک غریب خاندان کا بیٹا ہے۔ جس کے پاس قانون کی تعلیم کے حصول کے لیے مالی استطاعت نہیں ہے۔ اس کے خواب کو پورا کرنے کے لیے نائیجریا کی ایک مقامی تنظیم (Umuofia Progressive Union) کے اراکین، اور یوموفیا کے مقامی باشندوں نے یوموفیا گاؤں سے تعلق رکھنے والے اس غریب نوجوان کو انگلینڈ بھیجنے کے لیے ایک چندہ اکٹھا کیا ہے۔ اس امید پر کہ وہ واپس آکر اس تنظیم کا قرض اتارے گا۔ یوموفیا گاؤں کے معاونین نے اوبی سے امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں کہ جب انگلینڈ سے قانون کی تعلیم مکمل کر کے آئے گا تو نوآبادیاتی قانونی نظام میں اپنے لوگوں کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کی مدد کرے گا خاص طور پر زمین کے معاملات کے حوالے سے۔ اوبی نے انگلینڈ میں اپنے مضمون کو انگریزی میں تبدیل کر لیا ہے۔ انگلینڈ میں ڈانس کے دوران پہلی بار ایک طالب علم نرس کلارا اوکیکے سے اس نے ملاقات کی ہے۔ پہلی ہی نظر میں یہ کلارا اوکیکے کو دل دے بیٹھا ہے۔

اوبی چار سال کی تعلیم کے بعد نائیجیریا واپس آتا ہے۔ اس پر معاشی بوجھ ہے خاص طور پر اوموفیا تنظیم کے دیے گئے چندے کا۔ اوبی نائجریا کے ایک شہر لاگوس میں اپنے دوست جوزف کے ساتھ رہنا شروع کر دیتا ہے۔ چار سال کی تگ و دو کے بعد اسے اسکالرشپ بورڈ میں نوکری مل جاتی ہے۔ ابھی نوکری کے اوائل ایام چل رہے ہوتے ہیں کہ ایک شخص جو اپنی بہن کے لیے اسکالرشپ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اوبی کو رشوت کی پیشکش کر دیتا ہے۔ اوبی ناراضی سے اس پیشکش کو مسترد کر دیتا ہے تب وہ لڑکی خود اس سے ملنے آتی ہے۔ اب کی بار اوبی کو رشوت کے ساتھ جنسی لذت کی بھی پیشکش کر دی گئی ہے۔ تاہم اوبی اس پیشکش کو بھی

مسترد کر دیتا ہے۔ اوبی ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے جو دورانِ تعلیم "ملکی نظام کی بہتری پر" ایک تحقیقی مقالہ بھی لکھ چکا ہے۔ اس مقالے میں اوبی نے یہ دعویٰ بھی کر رکھا تھا کہ اگر ملکی انتظام و انصرام کی ذمہ داری اوبی جیسے دیانت دار، فرض شناس کو مل جائے تو ملک تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ ادھر کلارا اپنے مشن میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ وہ اوبی کو اپنی محبت میں گرفتار کر لیتی ہے۔ اوبی اس سے چھپ چھپا کر منگنی بھی کر لیتا ہے۔ ادھر اس کا بھائی کلارا کے تعلیمی اسکالر شپس کے حصول کے لیے اوبی کو رشوت دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اوبی کلارا کے ساتھ ایک جسمانی رشتہ استوار کر لیتا ہے۔ کلارا مذہبی حیثیت سے اوسو ہے۔ وہ اوبی کے ساتھ اس کے مقامی، روایتی طریقوں کے تحت شادی نہیں کر سکتی۔ وہ کلارا سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، لیکن اس کے والدین سخت مخالفت کرتے ہیں۔ اس کی ماں بستر مرگ پر اس سے التجا کرتی ہے کہ وہ کلارا سے اس کی موت تک شادی نہ کرے، اور دھمکی دی کہ اگر اس کا بیٹا نافرمانی کرتا ہے تو وہ خود کو مار ڈالے گی۔ جب اوبی نے کلارا کو ان واقعات سے آگاہ کیا، کلارا نے منگنی توڑ دی اور بتایا کہ وہ حاملہ ہے۔ اوبی نے اسقاط حمل کا انتظام کر دیا ہے۔ کلارا نے ہچکچاتے ہوئے اسقاطِ حمل کی گولیاں کھالی ہیں۔ حمل تو ضائع ہو گیا ہے مگر کلارا پیچیدگیوں کا شکار ہو گئی ہے۔ اب اس نے اوبی سے قطع تعلقی کر لی ہے۔ اوبی اپنی ناقص منصوبہ بندی کی وجہ سے، UPU کو اپنا قرض ادا کرنے اور اپنے بہن بھائیوں کی تعلیم اخراجات کی مد میں درکار رقم کی وجہ سے، اور کچھ حد تک غیر قانونی اسقاط حمل کی لاگت کی وجہ سے مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو چکا ہے۔ ادھر اوبی کی ماں بستر مرگ پر دم دے دیتی ہے۔ اپنی ماں کی موت کی خبر سننے کے بعد، اوبی ایک گہری افسردگی میں ڈوب جاتا ہے۔ مالی مشکلات کے سبب اوبی اپنی ماں کی آخری رسومات کے لیے گھر نہیں جاتا کیوں کہ اس کے پاس جو جمع پونجی تھی وہ کلارا کے اسقاطِ حمل پر ضائع کر چکا ہے۔ مالی مشکلات کے سبب وہ ہچکچاتے ہوئے رشوت لینا شروع کر دیتا ہے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہ رشوت لینا دنیا کا مروج طور ہے۔ ناول اس وقت اختتام کو پہنچتا ہے جب اوبی رشوت لیتا ہے اور خود کو دلاسا دیتا ہے کہ یہ آخری رشوت ہے جسے وہ لے گا، صرف یہ جاننے کے لیے کہ رشوت ایک دل چسپ تجربہ ہے یا نہیں؟۔ اوبی او کونکو کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اوبی کے اس عمل پر پورا شہر اس سے متنفر ہو اپڑا ہے۔

افریقی ناول نگاری چنیوا اچیبے کا یہ ناول خاصا طویل ہے۔ مترجم نے ناول کا ترجمہ کرتے وقت اسے بیس مختصر حصوں میں منقسم کیا ہے تا کہ قاری پر ناول کی طوالت گراں نہ گزرے۔

زیرِ بحث ناول "جہنم جاگتا رہتا ہے" کا انتساب مترجم نے حساس روحوں کے نام کیا ہے جو اپنے ساتھ جہنم لیے پھرتی ہیں۔ یہاں راقم کی نظر میں بے حس معاشرے میں حساسیت از خود عذاب ہے۔ یہ عذاب ایک طرح کا جہنم ہی تو ہے۔ مذکورہ ناول "جہنم جاگتا رہتا ہے" کا آغاز عرضِ مترجم سے ہوتا ہے۔ عرضِ مترجم کے تحت ڈھیرا صاحب یہ باور کرانے میں کافی حد تک کامیاب رہے ہیں کہ

ادب ان کا مشغلہ ہی نہیں جنون ہے، عشق ہے، اور یہ جنون تخلیقیت کے رنگ میں اپنا کتھارسس کرتا آیا ہے اور امید ہے کرتا رہے گا۔

ترجمہ نگاری نہایت پیچیدہ فن ہے۔ اس کارِ دشوار میں مترجم کا سیروں لہو خشک ہوتا ہے۔ ترجمہ نگاری ایک زبان سے دوسری زبان میں محض الفاظ کی منتقلی کا نام نہیں ہے۔ اس فن میں فن پارے کے متن میں غوطہ زنی کرنی پڑتی ہے۔ متن کو دوسری زبان میں ڈھالنے کے لیے بلاغت کا چپو چلانا پڑتا ہے، صرف بلاغت ہی نہیں، جامعیت، اختصاریت حتیٰ کہ زبان کے لسانی، گروہی، تہذیبی، ثقافتی پہلوؤں کو بھی مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ ترجمہ نگاری کی جگہ تصنیف نگاری نہایت سہیل ہے۔ مصنف کے سامنے پورا ادب بکھرا ہوتا ہے، نہ الفاظ کی قید، نہ حدود و قیود کا لحاظ، کھل کر زبان و بیان کا استعمال کیجیے، اگر پائے لغزش ادھر سے ادھر ہو گئی تو فکر کا ہے کو بات کو گھما پھرا کر واپس پلٹ آیئے۔ مگر مترجم کو متن کی قید میں رہتے ہوئے اس متن کے قریب تر معانی، مطالب اور مفاہیم کشید کرنا ہوتے ہیں۔ تعجب ہے سلیم اختر ڈھیرا صاحب پر کہ جناب جان بوجھ کر اوکھلی میں سر دیتے ہیں اور بارِ دگر استعجاب کہ دھمکوں سے بھی نہیں ڈرتے۔ موصوف ترجمہ نگاری کی اوکھلی میں دوسری بار سر ڈال رہے ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے ترجمہ میں زبان و بیان کی سلاست اور روانی کسی صورت بھی مجروح نہیں ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں معروف محقق ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں :

صرف روانی و سلاست ہی ترجمے کے بنیادی اجزاء نہیں۔ آپ خود اندازہ لگایئے کہ سنجیدہ و پیچیدہ تحریر کا ترجمہ صرف رواں اور سلیس کیسے ہو سکتا ہے؟ جب کہ زبان کا مزاج اور جملوں کی ساخت ہماری زبان کے مزاج سے مختلف ہو"(1)

ترجمہ نگاری میں بلاغت ترجمہ کی روح تصور کی جاتی ہے۔ اگر ترجمہ نگاری میں بلاغت کمزور ہو یہ سمجھا جاتا ہے کہ مترجم نے روح کو مجروح کر دیا ہے۔ یہ ترجمہ ادنا درجے کا شمار کیا جائے گا۔ یہ بات کافی حد تک درست ہے۔ چوں کہ ترجمہ کیا ہی اس لیے جاتا ہے کہ ایک زبان کے افکار و خیالات دوسری زبان میں منتقل کیے جائیں۔ اور اگر افکار و خیالات ہی مکمل ابلاغ نہ رکھتے ہوں تو ترجمے کا کیا فائدہ؟

زیرِ بحث ناول میں مترجم چنیوا اچیبے کے افکار و خیالات، اوبی او کونکو کی کہانی مکمل طور پر بلاغت کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ کس طرح اوبی انگلینڈ میں تعلیم حاصل کرنے جاتا ہے، تعلیم سے واپسی پر اسکالر شپ بورڈ میں ملازمت حاصل کرتا ہے، دورانِ ملازمت کس طرح کلارا کے عشق میں گرفتار ہوتا ہے، اور رشوت جیسے ناسور میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ کہانی بڑی طویل ہے۔ جگہ جگہ اس میں نئے نئے موڑ آتے ہیں، کہانی کئی پلٹیاں کھاتی ہیں۔ لیکن مترجم نے کسی صورت بھی کہانی کی بلاغت کو کمزور نہیں ہونے دیا۔

اردو زبان میں جملوں کی طوالت بلاغت کے باب میں زہرِ قاتل تصور کی جاتی ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے اردو زبان میں طویل جملے نہ صرف بلاغت پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ قاری کے تجسس پہ بھی وار کرتے ہیں۔ سلیم اختر ڈھیرانے ترجمہ کرتے وقت طویل جملوں کو چھوٹے چھوٹے اجزا میں تقسیم کر کے ترجمہ پیش کیا ہے جس سے بلاغت بھی قائم رہی ہے تو ساتھ ہی ساتھ قاری کی دلچسپی بھی۔ ایک خوبصورت مثال ملاحظہ کیجیے :

"ایسے شخص کی مثال صحرا میں برسے مینہ کی سی ہے۔ اس بابت میری تجویز تو یہ ہے کہ تم وہاں سھارنے سے پہلے ہی شادی کے بندھن میں بندھ جاؤ۔ مگر اب وقت کم رہ گیا ہے۔ بہ ہر حال تمہارے باہر بھیجے جانے کے اغراض و مقاصد سے تم بخوبی واقف ہو۔ تمہارا اولین مقصد تعلیم کا حصول ہے۔ دل لگی سے جڑے سب کھیل تماشے بعد کا قصہ ہیں۔ راحتوں کے حصول میں اس غزال کی طرح ہر گز عجلت نہ کرنا جس نے رقص کی اصل محفل سے پہلے ہی خود کو ناچ ناچ کر لنگڑا کر لیا تھا۔(2)

ترجمہ نگاری کے دوران اگر مترجم کے ذہن پر اختصاریت ہی غالب رہے تو یہ حد درجہ اختصاریت بلاغت کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہے۔ سلیم اختر ڈھیرا کے قلم میں کہیں کہیں اختصاریت نے بلاغت کو بھی متاثر کیا ہے۔ ایک مثال بہ طور حوالہ دیکھیے :

"اب چمک اور گرج کے ساتھ بارش ہونا شروع ہو گئی تھی۔ آغاز چھت پر ڈھم ڈھم کرتی کھانڈ پاروں برابر بارش سے ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے الگ الگ کپڑوں میں لپٹی چھاجوں کنکریاں آسمان سے نیچے انڈیل دی ہوں"(3)

ایک مترجم جب کسی فن پارے کا ترجمہ کرے تو اسے چاہیے جس زبان میں افکار و خیالات ترجمہ ہو رہے ہیں وہ الفاظ، تراکیب، محاورات مقامی زبان کے لسانی اصولوں سے متصل ہو۔ اس صورت میں اسے لسانی روابط سے کماحقہ آشنائی ہونی چاہیے۔ اگر مترجم ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو کسی بھی زبان کی تہذیب کو مقامی تہذیب کے رنگ میں گوندھ کر پیش کرے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سلیم اختر ڈھیرانے بیک وقت مغربی اور افریقی تہذیبوں کو مقامی تہذیبوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں بارش کو مینہ اور بارش کے قطروں کو کنیاں کہا جاتا ہے۔ مترجم نے ن مذکورہ ناول میں-مہنہ، کنیاں، چھاج-وغیرہ کو بیان کر کے مقامی تہذیب کا پرچار کیا ہے۔ صرف یہی نہیں زیرِ بحث ناول میں جابجا سلیم اختر ڈھیرانے اوبی کی زبانی مغربی تہذیب کو مقامی تہذیب کے رنگ میں پیش کیا ہے۔

ترجمہ نگاری میں شعر کا نثری ترجمہ زیادہ آسان ہے۔ عام طور پر چلن بھی یہی ہے کہ شعر کو نثر کے قالب میں ڈھال دیجیے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ضروری نہیں مترجم شعری اسلوب، اوزان و بحور سے بھی آشنا ہو۔ دوم یہ بھی ممکن ہے کہ مترجم نثری ترجمہ کر کے آسانی سے گزر جاتا ہے۔ سلیم اختر ڈھیرانے ناول "جہنم جاگتا رہتا ہے" میں آسانی کے بجائے مشکل امر کو نبھایا ہے۔ انگریزی شاعری کا ترجمہ اردو شاعری سے کیا ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے کہ موصوف اس سے قبل بھی انگریزی شاعری پر ایک کتاب "پیل لورز" لکھ چکے ہیں۔ یہی نہیں اس سے قبل ان کی ترجمہ نگاری پر مشتمل اطالوی لوک کہانیوں کا مجموعہ "کہانی

آوارہ ہوتی ہے" میں بھی جا بجا شاعری کے شعری تراجم دیکھے جاتے ہیں۔ موصوف شعری اسرار و رموز سے آشنا ہی نہیں ان کو نبھانا بھی خوب جانتے ہیں۔ ایک مثال دیکھیے :

مجھے تنہا نہ چھوڑنا اے یسوع مسیح
جب مرے قدم کھیتوں کی جانب اٹھ رہے ہوں
مجھے تنہا نہ چھوڑنا اے یسوع مسیح
جب مرا رخ بازار کی طرف ہوا
مجھے تنہا نہ چھوڑنا اے یسوح مسیح
جب میں حصولِ رزق کے لیے تگ و دو کر رہا ہوں
مجھے تنہا نہ چھوڑنا اے یسوح مسیح
جب گناہوں کی معافی کے لیے ہاتھ اٹھے ہوں
اے یسوح مسیح اسے تنہا نہ چھوڑنا
جب وہ گوروں کے دیس ہو گا(4)

عام طور پر ترجمہ کرتے وقت رموزِ اوقاف، جملہ معترضہ کا استعمال، کرداروں کی حرکات و سکنات وغیرہ کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ شاید ان لوازمات کو تصنیف کا حصہ سمجھا جاتا ہے ترجمہ نگاری کا نہیں۔ زیرِ بحث ناول میں مترجم نے ان تمام لسانی لوازمات کا خیال رکھا ہے جن کو تصنیف نگاری میں تو برتا جاتا ہے ترجمہ نگاری میں کم کم۔ موصوف خود انگریزی ادب کے استاد اور طالبِ علم ہیں۔ رموزِ اوقاف، املا، قواعد، جملوں کی نشست و برخاست، جملوں کی ترکیبی و نحوی صورتیں، محاورات کے درست استعمالات وغیرہ سے آشنا ہیں اس لیے ترجمہ نگاری میں بھی ان کو برت میں لاتے ہیں۔ جہنم جاگتا رہتا ہے سے ایک مثال دیکھیے :

آداب!
آداب!
کیا میں آپ کی اس محفل میں شریک ہو سکتا ہوں؟
جی ضرور!
میری خوش بختی، ارے! آپ لوگ پی کیا رہے ہیں؟
بھیا!(بیرے کو آواز دیتے ہوئے) شراب کی ایک بوتل زرا ان صاحب کے لیے بھی لا دیجیے۔(5)

کسی بھی کتاب کا پہلا ایڈیشن ایک طرح کا تسویدی ایڈیشن ہی ہوتا ہے۔ اس میں بہت سا سقم رہ جاتا ہے۔ جو وقت کے ساتھ خود بخود درستی میں آتا جاتا ہے۔ خاص طور پر پروف ریڈنگ کے مسائل۔ مذکورہ کتاب میں بھی یہی مسائل جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ کچھ کی طرف مترجم نے آخر میں فٹ نوٹ کے تحت ان کی نہ صرف نشان دہی کر دی ہے بلکہ ان کی تصحیح بھی چسپاں کر دی ہے۔ تاہم بہت سی املائی اغلاط کو شامل نہیں کیا گیا جس کی طرف راقم متوجہ کر رہا ہے تا کہ اگلے ایڈیشن میں ان کی تصحیح کی جا سکے۔ جیسا کہ صفحہ نمبر 121، 124 پر اوبی او کو نکو او کنکوہ، ذرا کو زرا، کے لیے کو کے لئے، مواقع کو مواقعوں، دیجیے کو دیجئے، وغیرہ۔

ترجمہ نگاری ایک جان جوکھوں کا کام ہے مگر مترجم نے اسے نہایت قرینے سے نبھایا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ناول افریقی اور مغربی تہذیب میں لکھا گیا ہے مگر مترجم نے اسے مقامی تہذیب کے رچاؤ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ترجمہ نہایت ہی شستہ و رواں ہے۔ مترجم نے اس مہارت کے ساتھ ترجمہ کیا ہے یہ ترجمہ نہیں ذاتی تصنیف لگنے لگی ہے۔ جملوں میں باہمی ربط ہے۔ ایک جملہ معنی اور اظہار کے لیے اگلے جملے سے باہم متصل ہے۔ ناول کو دل چسپ بنانے کے لیے شعری اسلوب بھی اپنایا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ کاوش از حد لائقِ تحسین ہے۔ اس دعا کے ساتھ کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ آمین!

حوالہ جات

1۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، "ترجمہ کے مسائل مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت مرتب ڈاکٹر رئیس، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2004ء، ص:105

2۔ سلیم اختر، ڈھیرا" جہنم جاگتا رہتا ہے" لاہور: عکس پبلی کیشنز، 2022ء، ص:23

3۔ ایضاً، ایضاً، ایضاً، ایضاً، ص: ص:91

4۔ ایضاً، ایضاً، ایضاً، ایضاً، ص:23

5۔ ایضاً، ایضاً، ایضاً، ایضاً، ص: ص:15

نسیم حجازی۔۔۔تحریک پاکستان کا عملی کردار

عذرا پروین پی ایچ ڈی اسکالر

ناردرن یونیورسٹی، خیبر پختونخواہ

نسیم حجازی کا اصلی نام محمد شریف اور قلمی نام نسیم حجازی تھا۔ نسیم حجازی ۱۹ مئی ۱۹۱۴ء کو پنجاب کے ایک گاؤں سوجان پور جو کہ قصبہ دھاڑیوال ضلع گورداس پور میں واقع ہے، میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور مستقلاً یہیں رہائش اختیار کی۔ زندگی کی ڈور ٹوٹنے تک آپ نے پاکستان سے اپنا ناتا نہیں توڑا۔ بالآخر مارچ ۱۹۹۶ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ آپ کے آباؤاجداد حجاز سے ہندوستان میں وارد ہوئے اور اپنی رہائش کے لیے انھوں نے پنجاب کے ضلع گورداس پور کا انتخاب کیا۔ نسیم حجازی کے والد کا نام چودھری جان محمد تھا جو کہ محکمہ انہار میں ملازم تھے۔ بچپن کے ابتدائی دور میں ہی آپ کی والدہ محترمہ داغِ مفارقت دے گئیں تو بارِ تربیت والد صاحب کے سر آن پڑا۔ ابتدائی تعلیم سوجان پور ہی میں حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۸ء میں ماسٹرز کی ڈگری اسلامیہ کالج لاہور سے حاصل کی۔ اسی دوران آپ نے چھوٹے موٹے موضوعات پر قلم آزمائی شروع کر دی۔ افسانہ نگاری میں قدم رکھتے ہوئے نسیم حجازی نے اپنا پہلا افسانہ "شادر" تخلیق کیا۔ اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں وہ اپنے قلمی نام کی جگہ بھی اپنا اصلی نام ہی استعمال کرتے تھے لیکن بعد میں جب ان کے استادِ محترم نے انھیں مشورہ دیا کہ اپنے لیے الگ قلمی نام کا انتخاب کریں تو انھوں نے اپنے قلمی نام کے لیے حجازِ مقدس سے اپنی نسبت کو افضل جانا اور اپنے لیے نسیم حجازی کے قلمی نام کا انتخاب کیا اور تاحیات اسی نام سے لکھتے رہے۔

برِ صغیر پاک و ہند میں پاکستان کا وجود ایک معجزے ہی کا مرہونِ منت دکھائی دیتا ہے اس کی خاص اور بنیادی وجہ انگریزوں اور ہندوؤں کا مسلم دشمنی میں ایک ہی صفحے پر اکٹھا ہو کر قیامِ پاکستان کی شدید مخالفت تھی اور یوں لگتا تھا کہ انگریز اور ہندو اپنے مقصد میں کامیاب رہیں گے تاہم قائدِ اعظم کی باہوش، باریک بیں، پُرجوش اور تند و تیز قیادت نے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر کھڑا کر دیا اور اپنی قیادت میں مسلمانوں کی حمیّتِ ملی کے جذبہ کو ابھار کر حصولِ آزادی کی طرف مائل کیا اور قلیل عرصہ میں تھکا دینے والی جدوجہد کے بعد کرۂ ارض کے نقشے پر پاکستان نام کے ایک قطعۂ ارضی کی تصویر ابھارنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ بات پوری دنیا پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ برِ صغیر کے سبھی مسلمانوں نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق ایک آزاد مملکت کے حصول کی کاوشات میں مقدور بھر نہ صرف اپنا حصہ ڈالا بلکہ اس کے لیے عملی قربانیاں بھی دیں۔ زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والے کسی بھی شخص نے اس مقصد کے حصول سے قدم پیچھے نہ ہٹائے۔

تحریکِ آزادی دوسرے لفظوں میں تحریکِ پاکستان کے لیے جتنے بھی راہنماؤں نے بغیر کسی لالچ اور طمع کے انتھک جدوجہد کی اس کے لیے پوری قوم پر ان تمام راہنماؤں کو خراجِ عقیدت پیش کیا جانا لازم ہے۔ کوئی بھی مصنف خواہ وہ قومی ہو یا بین الاقوامی شہرت

رکھتا ہو، سب نے ہی ان عظیم راہنماؤں کو اپنی تحریروں میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ حصولِ آزادی کے جو ہیرو اس وقت پیش پیش ہیں ان میں اکثریت نے اس جدوجہد میں اپنا حقیقی کردار ادا کیا ہے لیکن ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو حصولِ آزادی کی تحریک میں صرف علامتی کردار کے طور پر سامنے آتے ہیں اور وہ ان ثمرات کو سمیٹنے کی کوشش کر رہے ہیں جن پر ان کا کوئی حق نہیں بنتا۔ دوسری طرف اس تحریک کے بہت سے ہیرو ایسے ہیں جنہوں نے قائدِ اعظم کے سنگ تحریکِ آزادی کے لیے شدید محنت کی اور ان کی راہ سے فکری کانٹے ہٹا کر قوم کو یکجا کرنے کے منصب پر کام کیا۔ وہ سامنے آئے بغیر قائدِ اعظم کے شانہ بہ شانہ کام کرتے رہے۔ اس پہلو سے غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس قسم کی عملی جدوجہد کی شمولیت کے بغیر اتنی سرعت کے ساتھ حصولِ مقصد (قیامِ پاکستان) کی منزل تک پہنچنا تقریباً ناممکن تھا۔ اول الذکر علامتی ہیرو کو تو اپنے حصے سے زیادہ پذیرائی ملی اور وہ تحریکِ آزادی میں اپنی علامتی شمولیت کے ضرورت سے زیادہ ثمرات سمیٹ رہا ہے اور قوم کے اصل ہیروجنھوں نے بغیر کسی لالچ ، طمع اور نمود و نمائش کی طلب کے حصولِ مقصد کی خاطر تحریک کی ریڑھ کی ہڈی کو مضبوط کرنے کا کام کیا انھیں ان کا منصب عطا نہیں کیا گیا۔ ہر سال مختلف قومی دنوں جیسے ۲۳ مارچ، ۱۴ اگست ٦ ستمبر اور دیگر قومی ایام پر اُن لوگوں کو میڈل اور ایوارڈ دے کر اُنھیں تکریم دی جاتی ہے جنھوں نے درحقیقت تحریکِ آزادی میں عملی کی بجائے علامتی کردار ادا کیا تھا لیکن جن لوگوں نے اپنا خون، پسینہ، ذہنی، جسمانی اور عملی جدوجہد تحریکِ آزادی کی نظر کی ہے اُن کی خدمات کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیا جاتا ہے۔ ایسی ہی شخصیات میں ایک شخصیت نسیم حجازی کی بھی ہے۔ نسیم حجازی نے قوم کا ضمیر جھنجھوڑنے اور قوم کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لیے شب و روز محنت کی۔ نہ تو اُن کی زندگی میں اُن کی خدمات کو درخورِ اعتنا سمجھا گیا اور نہ ہی اُن کی وفات کے بعد کسی کے کان پر جوں تک رینگی کہ ان کی خدمات پر دو الفاظ ہی کہہ دیتا۔ قوم آج بھی اُن کی خدمات کا اعتراف کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہے تاہم ایک خوش کن بات سامنے آئی ہے کہ کانگریس نے اپنے اخبار'' تنظیم ''میں بلوچستان کی تاریخ اور صحافت کے عنوان کے تحت نسیم حجازی کا تذکرہ پاکستان سے الحاق کے سلسلے میں بلوچستان کی پرچم بردار تنظیم کے حوالے سے کیا ہے جنھوں نے راج (حکومت) کی سازشوں اور پروپیگنڈا کا منہ توڑ جواب دیا۔ اس میں یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ نسیم حجازی پاکستان کے سب سے بڑے صوبے بلوچستان میں نہ ہوتے تو وہ کبھی بھی پاکستان کا حصہ نہ بن سکتا تھا۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ بلوچستان کے عظیم راہنما اس امر کو تسلیم کرنے میں کسی بھی ہچکچاہٹ کا شکار نہیں کہ بلوچستان کے حوالے سے کانگریس صرف اور صرف نسیم حجازی ہی کی وجہ سے ناکام رہی۔ نسیم حجازی وہ شخصیت ہے جس کی رگوں میں حمیّتِ ملی سے بھرپور خون گردش کرتا تھا۔ وہ کسی حال میں بھی ہندوؤں کی غلامی قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ ریڈیو پاکستان، اسلام آباد کو ۲۰ مئی ۱۹۸٦ء کو دیے گئے ایک انٹرویو کے مطابق نسیم حجازی کے الفاظ اپنی طالب علمی کی زندگی کے دوران میں ہندوؤں کے زیرِ اقتدار رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

کانگریس اور برہمن سیاست کے لیے مجھے اپنے آباؤاجداد سے میرا تعصب وراثت میں ملا تھا۔ میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ ایک ایسا دن ضرور آنے والا ہے جب برِصغیر کے مسلمان اپنا نظریاتی قلعہ تعمیر کرنے جارہے ہوں گے۔" ۱

نوابزادہ جہانگیر خان تحریکِ آزادی کے ایک سپاہی ہیں جنھوں نے بلوچستان کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے لیے گراں قدر اور بارآور کوششیں کیں۔ وہ نسیم حجازی کی تحریکِ پاکستان اور بلوچستان کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے لیے کی گئی کاوشات کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں

"میں قسم کھاتا ہوں اگر نسیم حجازی ان دنوں بلوچستان میں نہ ہوتے تو بلوچستان کا پاکستان کے ساتھ الحاق مشکوک تھا۔" ۲

پورے برِصغیر پاک وہند کے عوام جہاں آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے وہیں بلوچستان کے عوام کو حکومت کی طرف سے بے دست وپا کر کے رکھ دیا گیا تھا۔ ۱۸۷۶ء تا ۱۹۳۵ء بلوچستان کے عوام کے بنیادی حقوق معطل رہے۔ حالت یہ تھی کہ انھیں کسی بھی فورم پر اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کی بھی ممانعت تھی یہاں تک کہ اُن کے لیے اخبارات کا حصول بھی ناممکن بنادیا گیا تھا ۔آزادی اور خود مختاری جیسے الفاظ ادا کرنا اُن کے لیے خواب کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایسے دگرگوں حالات میں بھی بلوچستان کے غیور عوام نے انگریز حکومت کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کیا۔ اولاً امیر مہراب خان کی سربراہی میں بغاوت ہوئی اور ناکام ٹھہری۔ ازاں بعد غلام حسین مسوری اپنے تیرہ سو جوانوں کے ساتھ انگریزوں کے مدِمقابل ہوئے۔ اس معرکے میں اُن کے دو سو جوانوں نے جامِ شہادت نوش کیا لیکن نتیجہ لاحاصل۔ اس کے بعد شاہجہاں جوگیزئی متعدد بار انگریزوں کے خلاف برسرِپیکار ہوئے۔

نواب یوسف علی خان نے کمال ہنرمندی کے ساتھ بلوچستان میں سیاسی بیداری کا بیج بویا۔ انھوں نے کراچی سے کئی اخبارات نکالے جن میں ''البلوچ''، ''بلوچستان''، ''بلوچستان جدید'' اور ''ینگ بلوچستان'' شامل تھے۔ جنھیں حکومتِ وقت نے یکے بعد دیگرے ضبط کر لیا۔ بلوچستان کے حوالے سے ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مسلم اکثریتی علاقہ ہونے کے باوجود آل انڈیا مسلم لیگ نے اس خطے پر بھرپور توجہ نہیں دی جس بنا پر نیشنل کانگریس نے یہاں مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کے خلاف شدید پروپیگنڈا کر کے عوام کو یہ امر باور کرانے کی بھرپور کوشش کی کہ مسلم لیگ حکومت نواز لوگوں پر مشتمل جماعت ہے جس وجہ سے بلوچستان کے عوام طویل عرصہ تک صحیح معنوں میں مسلم لیگ کی سرگرمیوں سے ناواقف رہے لیکن نیشنل کانگریس بہت لمبے عرصے تک بلوچستان کے باہمت، بہادر اور غیور عوام کو گمراہ نہ رکھ سکی۔ نوابزادہ جہانگیر خان جوگیزئی رقمطراز ہیں کہ:

"برِصغیر کی آزادی کے ناگزیر تصور اور سامراجی جبر کی ڈھلتی ہوئی گرفت کو دیکھ کر انگریزوں نے جغرافیائی اہمیت کے حامل اور معدنی وسائل سے مالا مال بلوچستان کو ایک الگ تھلگ صوبہ بنانے کی کوششیں شروع کر دیں اپنی سازشی منصوبہ بندی سے وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان سے الگ کر کے بلوچستان پر اپنا اثر ورسوخ قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے قدرتی وسائل کا استحصال کرتے ہوئے اپنی معیشت کو مضبوط بنا سکیں اور اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیے اسے روس کے خلاف قلعہ بنا سکیں۔" ۳

جن دنوں پاکستان تحریک پورے زور وشور کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی اُنہی دنوں انگریزوں اور ہندوؤں نے اپنی سازشوں کو تقویت دیتے ہوئے نہ صرف اس تحریک کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کر دیے بلکہ مذموم ذہن کے مالک بہت سے عناصر نے فسادات کو بھی ہوا دی۔ مارچ، اپریل ۱۹۴۷ء میں ہونے والے فسادات میں اتنا زیادہ نقصان ہوا کہ قائدِ اعظم اور گاندھی کو امن کے لیے مشترکہ اعلامیہ شائع کروانا پڑا۔ نسیم حجازی کا تحریکِ پاکستان اور بلوچستان کے پاکستان سے الحاق کی تحریک سے ناطہ اُسی دن جڑ گیا تھا جس دن وہ روزنامہ ''زمانہ'' سے علیحدگی اختیار کر کے کراچی سے بلوچستان روانہ ہوئے تھے۔ برِ صغیر میں چلنے والی قوم پرست تحریکوں کی طرف اُن کا جھکاؤ ایک طویل عرصہ سے تھا۔ نسیم حجازی کہتے ہیں:

"ابتدائی دنوں سے ہی میں مسلم لیگ اور پاکستان تحریک کی طرف مائل تھا۔ میں اپنی منزل کا تصور کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے مجھے مختلف علاقوں کا دورہ کرنا پڑا اور آخر کار میری جستجو مجھے کراچی لے آئی۔" [۴]

کراچی میں نسیم حجازی روزنامہ ''زمانہ'' کے ذریعے زور وشور سے بلا خوف وخطر تحریکِ پاکستان کے لیے کام کرتے رہے۔ روزنامہ ''زمانہ'' کی وجہ سے تحریکِ پاکستان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے سندھ میں کانگریس کی وزارت نے روزنامہ ''زمانہ'' کے مالک کو مالی منفعت پہنچا کر خریدنے کی کوشش کی۔ نسیم حجازی کو جب اپنے مالک کی زبانی رقم کے حصول کی آگاہی ہوئی تو انھوں نے ''وار فنڈ'' کے عنوان سے ایک اداریہ تحریر کیا اور اپنے اخبار سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نسیم حجازی کا خیال تھا کہ اُن کا اخبار اپنے مشن اور مقصد کے ساتھ مخلص نہیں رہا۔ بعد ازاں شیخ مقبول الحق کے توسط سے ان کی ملاقات میر جعفر خان جمالی سے ہوئی۔ نسیم حجازی اُن کی جاگیر دارنہ ذہنیت کو دیکھتے ہوئے اُن کے ساتھ کام کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔ بعد میں جب انھیں یقین ہو گیا کہ میر جعفر خان جمالی کے مقاصد بلوچستان میں تحریکِ پاکستان کے مترادف ہیں تو وہ ادبی کام کی سرپرستی کے لیے رضامند ہو گئے۔ میر جعفر خان جمالی کے ہمراہ انھوں نے کافی عرصہ سیاسی سرگرمیوں میں گزارا اور تحریکِ پاکستان کی کئی ایک سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں:

"نو سالوں کے عرصہ میں مَیں ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک کردار کی حیثیت سے بلوچستان میں چل رہے سیاسی ڈرامے کا حصہ رہا۔" [۵]

کراچی یونیورسٹی نے نسیم حجازی کی ناول نگاری پر ایک تحقیقی مقالہ بھی کروایا جس کا عنوان ''نسیم حجازی کی تاریخی ناول نگاری کا تحقیقی اور تنقیدی تجزیہ'' ہے۔ اس مقالہ کے محقق ممتاز عمر ہیں۔ میر جعفر خان جمالی نے ''تنظیم'' کے نام سے ایک اخبار نکالا اور نسیم حجازی کو اس کا منصبِ ادارت تفویض کیا۔ نسیم حجازی کو مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن (پاکستان) حاصل کرنے کا جنون تھا لہٰذا انھوں نے اس اخبار کے ذریعے قوم کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کی سرتوڑ کوشش کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے بلوچستان کے پاکستان سے الحاق کے مقصد پر کام کرتے ہوئے دن رات ایک کر دیا۔ نوابزادہ جہانگیر خان جوگیزئی کے مطابق:

"میں نے پہلی بار میر جعفر خان جمالی کے ہاں نسیم حجازی سے ملاقات کی تاہم اس کا نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔ میں اُسے پہلے ہی سے میر جعفر خان جمالی کے ایک ساتھی اور "تنظیم" کے مدیر کی حیثیت سے اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ نسیم حجازی کی جو آواز بلوچستان کے سیاسی میدان میں سنی جارہی ہے وہ تیزی سے بلوچستان کے روشن خیال لوگوں کی آواز بنتی جارہی ہے۔"[6]

نوابزادہ جہانگیر خان جوگیزئی مزید تبصرہ کرتے ہیں کہ:

" میرا تاثر اُس کے بارے میں یہ تھا کہ یہ شخص بلوچستان کو ہاتھوں کی لکیروں کی طرح جانتا ہے۔"[7]

نسیم حجازی نے مذکورہ اخبار کے ذریعے نیشنل کانگریس کے گمراہ کُن اور تباہ کن پروپیگنڈے کا منہ توڑ جواب دیا۔ نسیم حجازی کے اندر قدرت نے ایسی خصوصیات ودیعت کرر کھی تھیں کہ وہ اپنے کسی بھی ساتھی کو بجلی کی سی تیزی سے متحرک کرسکتے تھے۔ نسیم حجازی سے اپنے تعلق کی بناپر سیّد ہاشم رضا نسیم حجازی کی شخصیت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

"۴۷۔ ۱۹۴۰ء کے دوران مسلم لیگ ہی واحد جماعت تھی جو پاکستان کے حصول کے لیے کوشاں تھی۔ وہ تمام لوگ جو اس زمانے میں قائدِاعظم کے شانہ بشانہ کھڑے تھے وہ قابلِ احترام تھے اور نسیم حجازی بھی اُن میں سے ایک تھے۔ میرے خیال میں بلوچستان میں مسلم لیگ کے حق میں پروپیگنڈہ کا نصف نسیم حجازی اور باقی نصف میر جعفر خان جمالی نے چلایا تھا۔"[8]

نسیم حجازی کا بلوچستان جانے کا سب سے اہم مقصد تحریکِ پاکستان میں شمولیت تھا بقول اُن کے :

" ۱۹۴۲ء میں پاکستان کے لیے میرے جذبے نے مجھے اُس پہنچادیا جہاں میری ضرورت تھی۔ میں میر جعفر خان جمالی کے ایک ساتھی کی حیثیت سے بلوچستان گیا جہاں میں نے اپنا بیش تر وقت کتابیں پڑھنے اور بلوچستان کے حالات کا تجزیہ کرنے میں صرف کیا۔ حصولِ پاکستان کی خواہش میرے لیے دنیا کی کسی بھی دولت سے زیادہ قیمتی تھی۔"[9]

جس وقت مسلم لیگ نے بلوچستان کے خطے میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا اس وقت بہت سے مقامی راہنما بلوچستان میں نیشنل کانگریس کے نظریۂ اکھنڈ بھارت کو فروغ دینے میں شب وروز مصروف تھے۔ مسلم لیگ کے زیرِاہتمام بلوچستان میں پہلی کانفرس ۱۱۔۱۰ جون کو کوئٹہ میں منعقد ہوئی اور جولائی۔ اگست ۱۹۳۹ء کو مولانا ظفر علی خان کوئٹہ آئے اور انھوں نے پورے بلوچستان کا دورہ کیا۔ جون ۱۹۴۳ء کو قائدِ اعظم بہ نفسِ نفیس بلوچستان تشریف لائے اور لوگوں کو مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دی ۔انھوں نے مسلمانوں کو انتشار کا شکار نہ ہونے اور ایک ہی سیاسی جھنڈے تلے متحد ہو کر رہنے کا مشورہ بھی دیا۔ تحریکِ پاکستان کے ضمن میں مسلم لیگ کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ اور طاقت کو دیکھتے ہوئے انگریز حکومت کو اس امر کا اندازہ ہو چکا تھا کہ جلد یا بدیر تقسیمِ ہند ناگزیر ہے تاہم حکومت کی پوری کوشش تھی کہ بلوچستان کو ممکنہ نئی معرضِ وجود میں آنے والی ریاست (پاکستان) کا حصہ نہ بننے دے۔

نسیم حجازی کے لیے پاکستان کی محبت اور تحریکِ پاکستان اُن کا حقیقی اثاثہ تھے۔ انھوں نے تحریکِ پاکستا میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے دن رات ایک کر دیے۔ اُن کے اپنے الفاظ میں:

"پاکستان کے بغیر میں اپنی زندگی کا ایک دن بھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور دوسری ہر خواہش اس جذبے سے کمتر تھی۔ میری زندگی کے سب سے مصروف سال ۴۷۔۱۹۴۵ء تھے۔ میرا زیادہ تر وقت تحریکِ پاکستان میں صرف ہوا اور دوسری بات یہ کہ میری زندگی میں بلوچستان کے پاکستان سے الحاق کی کوششوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ یکم اگست سے چودہ اگست تک یہ اپنے عروج پر تھا جب میں اپنے کام کے لیے اوسطاً ڈھائی/تین گھنٹے بچا سکتا تھا۔"[۱۰]

تحریکِ پاکستان جب اپنے عروج پر تھی تو اِس کے مخالفین نے سہ رُخی محاذ کھول کر اسے ناکام بنانے کی شدید کوشش کی۔ ان میں پہلا محاذ انگریزوں (حکومت) کا تھا اُن کی پوری کوشش تھی کہ خان آف قلات اپنی خود مختاری کا علان کر کے برطانیہ کی حمایت کا اعلان کر دیں دوسرا محاذ اُن لوگوں کا تھا جو ہندوؤں اور نیشنل کانگریس کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ ان میں قابلِ ذکر عبدالصمد خان اچکزئی، مرزا فیض اللہ عبدالقادر اور چندرمان وکیل پیش پیش تھے۔ یہ لوگ بلوچستان کے ہندوستان سے الحاق کے مقصد پر کام کر رہے تھے۔ تیسرے محاذ میں وہ لوگ شامل تھے جو اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے تھے جنھیں تحریکِ پاکستان کے مخالفین اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہوئے مسلم لیگ کی کاوشات کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ نسیم حجازی نے سہ رُخی لڑائی لڑتے ہوئے ان تمام محاذوں کا مؤثر انداز میں جواب دیا۔ بقول نوابزادہ جہانگیر خان:

"نسیم حجازی کی کوئٹہ آمد کے بعد پاکستان تحریک ایک پارٹی ہی کی نہیں بلکہ قومی تحریک بن چکی تھی۔"[۱۱]

نسیم حجازی بلوچستان کے عوام میں پاکستان تحریک اور اُس کے مقاصد کے حوالے سے بیداری کی مہم چلا رہے تھے۔ نسیم حجازی حکومتِ وقت (انگریزوں) اور ہندوؤں کی تمام تر سازشوں کے باوجود کسی بھی مرحلے پر اپنے مقصد سے ناامید نہ ہوئے۔ انھیں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کے لیے روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک کا بھی ادراک تھا اور مسلمانوں کی یہ رسوائی انھیں تکلیف دہ کیفیت سے دوچار رکھتی تھی۔ جب مسلم لیگ نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے عملی کوششیں شروع کیں تو نسیم حجازی اور اُن کے ساتھیوں نے اس میں اپنا حصہ ڈالتے ہوئے اِن کاوشات کو مزید تقویت پہنچائی۔ آئین ساز اسمبلی کے لیے نوابزادہ محمد خان جوگیزئی کا انتخاب بھی نسیم حجازی کے مشورہ پر عمل میں آیا جو کہ بلوچستان کے پاکستان سے الحاق کی سمت ایک اہم قدم تھا۔ اس ضمن میں نسیم حجازی نے مشورہ دیا تھا کہ کانگریس کے امیدوار کے لیے اس میدان کو کھلا نہ چھوڑا جائے۔ طویل بحث مباحثے کے بعد نسیم حجازی نواب محمد خان جوگیزئی کو اس سیٹ پر الیکشن لڑنے پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

بلوچستان میں شاہی جرگہ کو قانون ساز اسمبلی کے طور پر ایک اہم مقام حاصل تھا لہٰذا انگریزوں نے اپنی سازشوں کی حمایت کرنے کے لیے شاہی جرگہ کو بلوچستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا۔ آئین ساز اسمبلی میں نوابزادہ محمد خان جوگیزئی نے مسلم لیگ

کی حمایت کر کے بلوچستان کے پاکستان سے الحاق کی راہ ہموار کر دی۔ نسیم حجازی نے عملاً بلوچستان کے پاکستان سے الحاق کے لیے دن رات ایک کر دیے۔ راتوں کو جرگہ کے اراکین سے ملاقاتیں کر کے مدلل انداز میں پاکستان میں شمولیت کے لیے راضی کرتے تھے اور دن میں اپنے اخبار ''تنظیم'' میں مضامین لکھ کر نہ صرف مسلمانوں کی راہنمائی کرتے بلکہ دشمن کے پروپیگنڈہ کا مقابلہ بھی کرتے۔

بلوچستان میں رائے شماری کے لیے ۲۹ جون ۱۹۴۷ء کا دن مقرر ہوا۔ محسوس ہوتا تھا کہ پاکستان کے حق میں فیصلہ آنا مشکل ہے لیکن نسیم حجازی نے ہمت نہ ہاری اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے لگاتار کوششیں کرتے رہے۔ بلوچستان کے دگرگوں حالات کے بارے میں مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کی توجہ مبذول کروانے کے لیے ۱۶ جون ۱۹۴۷ء کو اپنے ہفتہ وار اخبار ''تنظیم'' میں انھوں نے ''لمحۂ فکریہ'' کے عنوان سے ایک خصوصی اداریہ لکھا جس کے مطابق بلوچستان کے بغیر کوئی پاکستان کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے مسلسل کوششوں کے ذریعے قائدِ اعظم اور قبائلی سرداروں کے مابین ملاقات کا بندوبست بھی کیا۔ حاصلِ نتیجہ یہ کہ قبائلی سرداروں کے اذہان سے شکوک و شبہات کا غبار دور ہونے سے وہ پاکستان کی حمایت کرنے پر رضامند ہو گئے۔ نسیم حجازی تحریکِ پاکستان کے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے کارکنان کو بھی خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں :

"آج جب میں بلوچستان کی تاریخ کا ایک باب لکھتا ہوں تو میں بلا کسی ہچکچاہٹ کے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ بلوچستان میں ریفرنڈم کی جنگ کے دوران مسعود خدادار پوش پاکستان کا بہترین فوجی اور اس کے قلعے کی ایک ٹھوس دیوار ثابت ہوا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ایک نوجوان آئی سی ایس آفیسر ہماری حیرت انگیز کشتی کے لیے روشنی بن کر ابھرا اور ایک نوجوان ای اے سی نے کشتی کے منتظم کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔" ۱۲

کانگریس کے متعصب کردار نے بھی اپنا اثر دکھایا اور شاہی جرگہ کے اراکین کو اجتماعی سوچ کی بجائے انفرادی سوچ کی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے قبائلی سردار اپنا اقتدار کھو دیں گے اور یہ کہ قیامِ پاکستان قبائلی نظام اور بلوچ عوام کے حقوق کی پامالی کی طرف ایک بڑا قدم ہے۔ بلوچستان سے ہونے والی آمدنی اور اخراجات کا ضمیمہ شائع کر کے بلوچ سرداروں کو یہ باور کرانے کی کوشش بھی کی گئی کہ بلوچستان کا پاکستان سے الحاق سودے بازی کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ کانگریس نے ایک منافقانہ عمل یہ بھی کیا کہ بلوچستان کے عوام میں تفریق ڈالنے کے لیے پٹھان آبادی کو اکسا کر پٹھانستان کا نعرہ بھی بلند کیا اور ساتھ ساتھ بلوچوں اور پٹھانوں میں ایک دوسرے کی غلامی کے خدشات کو بھی ہوا دی۔ آزاد بلوچستان یا بلوچستان کے افغانستان سے الحاق کے بارے میں ایک علامیہ بھی جاری کیا گیا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ کانگریس کی طرف سے نواب محمد خان جوگیزئی کو ایک ایسے وقت میں ۱۸۰ ملین روپے کی پیش کش کی گئی جب بلوچستان کی کل آمدنی صرف ۱۵ ملین روپے تھی۔

نسیم حجازی کی تصنیفات میں ''خاک و خون''، ''آخری چٹان (جلد اول و دوئم)''، ''آخری معرکہ''، ''اندھیری رات کے مسافر''، ''اور تلوار ٹوٹ گئی (جلد اول و دوئم)''، ''داستانِ مجاہد''، ''گمشدہ قافلے''، ''انسان اور دیوتا''، کلیسا اور آگ''، ''محمد بن قاسم''، ''پاکستان سے دیارِ حرم تک''، ''پردیسی درخت''، ''پورس کے ہاتھی''، ''قافلۂ حجاز''، ''شاہین (جلد اول و دوئم)''، ''سو سال بعد'' اور ''سفید'' جزیرہ شامل ہیں۔ نسیم حجازی کی ان کتب سے ان کی پاکستان اور اسلام سے محبت کی اعکاس ہیں اور ان تحریروں سے یہ بھی پتہ چلتاہے کہ کس طرح انھوں نے عوام کے اذہان کو پاکستان کے حق میں تبدیل کیا۔ دیگر وجوہات کے ہمراہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کانگریس بلوچستان میں جو غلط تاثر پیدا کر کے اپنے مذموم مقاصد کو حاصل کرنا چاہتی تھی اُسے واضح طور پر اس میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور کانگریس کی سازشوں کا ادراک رکھتے ہوئے انھوں نے بڑے مستحسن طریقہ سے اُسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

انھوں نے نواب جہانگیر خان کو مشورہ دیا کہ ہم نے بلوچستان کے سٹیج پر کھیلے جانے والے ڈرامہ میں برطانیہ کا ڈرامائی کردار کو دیکھا ہے۔ اب ہماری باری ہے کہ اس سٹیج پر کھیلے جانے والے ڈرامے کا آخری ایکٹ ہم پیش کریں۔ نسیم حجازی کو بطور صحافی ۲۹ جون کو ٹاؤن ہال میں ہونے والی کاروائی کی بھنک پیشگی مل گئی تھی کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن مزید وقت طلب کر کے پاکستان کے حق میں دیے جانے والے فیصلہ کو مؤخر کرنے کی کوشش کریں گے لہٰذا انھوں نے اسی تاریخ کو فیصلہ لینے کے لیے بھرپور کوششوں کا آغاز کر دیا ۔ انھوں نے نواب محمد خان جوگیزئی کو بھی راضی کر لیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے مزید وقت طلب کرنے کے فیصلہ کو مسترد کر دیں اور اُسی دن فیصلہ سنانے پر اصرار کریں۔ لہٰذا وہی ہوا جو نسیم حجازی چاہتے تھے جب مسٹر جیفری پرئر (Mr. Jeffery Prayer) نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے حکم نامے کو پڑھنے کا آغاز کیا تو نواب صاحب اعتماد کے ساتھ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور یوں گویا ہوئے:

"ہمیں اس فیصلے کے لیے مزید وقت کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ قبائلی جرگہ کے سربراہان نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ ہم یہاں سے اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا نمائندہ پاکستان کی آئینی اسمبلی کا حصہ ہو گا اور اس فیصلے کے خلاف تمام لوگ ابھی اپنا راستہ الگ کر سکتے ہیں۔"[۱۳]

نوابزادہ محمد خان جوگیزئی کے جرأت مندانہ فیصلے کی مطابعت میں جرگہ کے دوسرے سربراہان نے بھی اپنا ووٹ پاکستان کے حق میں دیا جس پر مسٹر جیفری نے یہ اعلان کیا کہ وہ وائسرائے کو ایک ٹیلی گرام بھیج کر جرگہ کے فیصلہ سے آگاہ کریں گے۔ یہ اعلان سننے کے بعد نسیم حجازی باہر آئے اور جوش و جذبے سے بھرپور نعرہ لگایا، ''پاکستان زندہ باد''۔ یوں نسیم حجازی نے اپنی عقل و بصیرت اور دن رات کی محنت سے بلوچستان کے پاکستان سے الحاق کو ممکن بنا دیا۔

نسیم حجازی کے تین ناولوں کو PTV نے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ڈراموں کے طور پر TV سے نشر کیا۔ ان ناولوں میں آخری چٹان اور شاہین (جلد اول و دوئم) شامل ہیں۔ تاریخی حوالے سے PTV کے اب تک فلمائے گئے ڈراموں میں آخری چٹان کو اولین مقام حاصل ہے۔ اس ڈرامہ میں سلطان جلال الدین کے کردار کو جس انداز میں سلیم ناصر نے نبھایا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ نسیم

حجازی کے ناول ''خاک اور خون'' پر اسی نام سے بنائی جانے فلم کو پاکستانی فلم انڈسٹری یا لاہور فلم انڈسٹری کی چند بلاک بسٹر فلموں میں چوٹی کا مقام حاصل ہے۔

بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کے ایک اہم ہیرو جس نے پاکستان کے تخلیقی عمل میں اپنی روح اور اندرونی جذبے کے تحت ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا اسے ہم قومی سطح پر کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں ہیں۔ نواب محمد خان اس وقت جب بلوچستان کی کل آمدنی صِرف ۱۵ ملین روپے تھی، ۱۸۰ ملین روپے کی پیش کش کو ٹھکرانے والا عظیم راہنما اور نوازادہ جہانگیر خان جو تحریکِ آزادی کے ایک حوصلہ مند ہیرو ہیں، نسیم حجازی کی تحریکِ پاکستان اور بلوچستان (جو کہ پاکستان کا حصہ ہے) کے لیے خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں تو پاکستانی مؤرخ اس سلسلے میں ہچکچاہٹ کا شکار کیوں ہے؟ ظاہری طور پر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی مؤرخ اور مصنفین ان کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں اور نہ ہی جاننا چاہتے ہیں یا پھر انھیں جان بوجھ کر نظر انداز کیا جا رہا ہے ۔ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہمارے مؤرخین (معذرت کے ساتھ) انھی لوگوں کی خدمت میں اپنے آپ کو وقف کر چکے ہوں جہاں سے انھیں کچھ ملنے کی امید ہو لہٰذا وہ اپنا پورا زور صرف انھی کو ہیرو ثابت کرنے میں لگا رہے ہوں جنھوں نے صرف علامتی طور پر یا ضمنی طور پر تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا ہو۔

بلوچستان کا پاکستان کے ساتھ الحاق ایک زندہ حقیقت ہے اور اس کی ایک باقائدہ تاریخ موجود ہے جس میں سے نسیم حجازی کی خدمات صَرفِ نظر کرنے سے بلوچستان کی تاریخ مکمل نہیں رہ پائے گی بلکہ مسخ ہو کر رہ جائے گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نسیم حجازی کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے پاکستان تحریک (تحریکِ آزادی) اور تاریخِ پاکستان کی کتابوں پر نظر ثانی کر کے نسیم حجازی کی خدمات کو اُن کتابوں کا حصہ بنایا جائے کیوں کہ زندہ قومیں کبھی بھی اور کسی حال میں بھی اپنے ہیرو، راہنما، مددگاروں اور مجاہدین کی خدمات کو فراموش نہیں کرتیں اور پاکستانی قوم تو ایک بہادر، غیور اور غیرت مند قوم ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ریڈیو پر ایک گفتگو، بشکریہ: ریڈیو پاکستان، اسلام آباد، ۲۰ مئی ۱۹۸۶ء

۲۔ کوثر، انعام الحق، ڈاکٹر، ''جدوجہدِ آزادی میں بلوچستان کا کردار''، ادارہ تحقیقِ پاکستان، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۳۷۰

۳۔ ایضاً، ص ۳۰۸

۴۔ فاروق، ایم سیّد، اے''، تحریکِ پاکستان اور بلوچستان''، مہران پبلیکیشنز، کراچی، ۱۹۷۷ء، ص ۱

۵۔ ایضاً، ص ۱۸

۶۔ ایضاً، ص ۶۶

۷۔ ایضاً، ص ۶۶

۸۔پندرہ روزہ، ''پاسبان''، کوئٹہ ،۱۵جون ۱۹۳۹ء، ص ۶
۹۔ریڈیو پر ایک گفتگو، بشکریہ :ریڈیو پاکستان، راولپنڈی، ۱۲جولائی ۱۹۸۵ء
۱۰۔''اقرا، قائدِ اعظم نمبر''، گورنمنٹ ایم اے او کالج، لاہور، جون ۱۹۷۶ء، ص ۱۴۷۔۱۴۸
۱۱۔''نظام''، کراچی، ۲۰ مارچ ۱۹۴۷ء
۱۲۔تصدق حسین، راجہ، ''نسیم حجازی، ایک مطالعہ''، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۹۰
۱۳۔ہفتہ وار، ''تنظیم''، کوئٹہ ،۲۳ دسمبر ۱۹۴۷ء

منیر عباس سپرا، پی ایچ۔ڈی سکالر

اس میں کوئی شک نہیں کہ عصر حاضر کی خواتین افسانہ نگاروں میں ثمینہ سید ایک نامور افسانہ نگار ہیں۔ان کے اب تک دو افسانوں کے مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔پہلا افسانوی مجموعہ "ردائے محبت" سیوا پبلی کیشنز لاہور سے 2011ء میں شائع ہوا ہے۔دوسرا افسانوی مجموعہ "کہانی سفر میں ہے" بھی سیوا پبلی کیشنز لاہور سے 2016ء میں منظر عام پر آیا۔ان کا ایک شعری مجموعہ بھی چھپ چکا ہے اور تیسرا افسانوی مجموعہ زیر طبع ہے۔

ان کا ہر افسانہ موضوع کے لحاظ سے مختلف اور بوقلمونی صلاحیت سے بھرپور ہوتا ہے۔ان کی کہانیاں معاشرے میں پھیلے ناسوروں کی نشاندہی بھی کرتی ہیں اور کبھی کبھی ان پر مرہم بھی لگاتی ہیں۔ان کی کہانی کے آغاز کی بنت اختتام سے جدا ہوتی ہے لیکن پڑھتے ہوئے احساس نہیں ہوتا کہ کہاں حقیقت کے رنگ افسانے میں آمیختہ ہو گئے ہیں۔ان کے افسانوں کے موضوعات میں سماجی مسائل،طبقاتی تقسیم، جنسی ونفسیاتی پہلو،اور روزمرہ زندگی میں درپیش آنے والے ہر پہلو کو موضوع بنایا ہے۔ان کے افسانوں میں انسانی اعمال اور معاشرتی وسماجی احوال کو خوردبینی نظر سے دیکھا یا گیا ہے۔افسانہ نگار نے جدید دور کے انسان کے ذہنی رویوں اور نفسیاتی مسائل کو سادہ اور رواں اسلوب میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔یہ بھی ان کا کمال فن ہے کہ وہ افسانے کو بے جا طوالت سے بچاتے ہوئے محدود اور منتخب لفظوں میں کامیابی سے قاری تک وہ پیغام پہنچا دیتی ہیں جس نے انہیں قلم اٹھانے پر اکسایا ہوتا ہے۔ثمینہ سید کی فن کاری یہ ہے کہ انہوں نے کہانی کے بنیادی عناصر کو جدید طرز اظہار پر قربان نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس ان کے ہاں افسانے کا بنیادی جوہر اور کہانی کا جدید تر اسلوب کہانی میں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ثمینہ سید صاحبہ کی کہانی گھریلو معاشرت اور دیگر سماجی رہن سہن کی تصویر کشی کرتے ہوئے عہد حاضر کے المناک سانحات تک رسائی رکھتی ہے۔کہانی کے اس سفر میں سماجی اور معاشرتی زندگی کی جھلکیاں ہی نہیں بلکہ آج کا سارا سماج اور معاشرت نظر آتی ہے۔ان کے افسانوں میں معاشرتی رویوں کی ناہمواریوں کا کینوس خاصا وسیع نظر آتا ہے۔زمانے کی ہوس ناکی کا نشانہ بنا انسان کہاں مرتا اور ٹوٹتا ہے۔عزت اور شرافت کا بھرم رکھنے کے لیے وہ کن اذیتوں سے گزرتا ہے۔یہ سب کچھ ان کے افسانوں میں موجود ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ خود افسانہ نگار ان کہانیوں کا ہی کوئی کردار ہے۔ان افسانوں کے موضوعات میں عام گھر کے ماحول ،تعلق داریوں،انسانی ہمدردی اور خلوص کے جذبوں کی بھی تفصیل ملتی ہے۔عداوتیں ہیں،رقابتیں ہیں جن کا رشتہ کہیں معاشی مسائل سے تو کہیں سماجی بے راہ روی سے ہے۔

یہ انداز نگارش بہت کم افسانہ نگاروں کے ہاں ملتا ہے کہ کہانی اپنے خارجی ماحول میں بڑی روایتی سیدھی مساوی اور بڑی عام فہم سی معلوم ہوتی ہے۔لیکن اس کی داخلی جہت بہت پر آشوب پیچیدہ، معنی خیز اور کسی بڑے فکری نتیجے کا مظہر بن کر ابھرتی ہے۔

ثمینہ سید کے افسانوں میں کردار نگاری، منظر کشی، خارجی اور داخلی کیفیتوں کا بیان، انسانی جذبات واحساسات کی عکاسی تو بالکل اپنے فطری اور بھرپور انداز میں تمام تر جزئیات کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن ان کا روحانی طرز احساس اور موضوع کی مناسبت سے مضبوط اور مربوط زبان و بیان ان کی کہانی اور ان کے افسانوں کو بہت پر اثر اور سحر آفریں بنا دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں یوں تو بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ان کے افسانوی مجموعے "ردائے محبت" کی ایک کہانی کا آغاز ان کی فنی مہارت اور عمیق مشاہدے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

" فضا آج پھر بوجھل تھی عجیب سوگواریت چھائی ہوئی تھی۔ میں چلتا تو پتے پاؤں کے نیچے یوں چرمراتے جیسے رو رہے ہوں۔ بین کر رہے ہوں مجھے پاؤں اٹھانا پڑے غیر ارادی طور پر سنبھلنا پڑتا کہ کہیں میری وجہ سے انھیں تکلیف کہ ہو رہی ہو۔ لیکن ایک میرے سنبھلنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں نے میں نے اپنے ارد گرد چلتے بے فکرے چہروں کو دیکھا جو سب جلدی میں نظر آرہے تھے۔ چہرے اتنے خالی اور سپاٹ کہ دماغ کے چوپٹ ہونے کے غماز نظر آتے تھے۔"

(اقتباس: افسانہ، شبو)

ثمینہ سید نے متوسط طبقے کے افراد کے متعلق زیادہ افسانے لکھے ہیں ان کے فن کی یہ خوبی ہے کہ انہوں نے جس کردار کو پیش کیا حسب ضرورت ان کی زبان اور طرز معاشرت بھی اسی طرح بیان کی ہے۔ پہلے ان کے ابتدائی افسانوں میں کرداروں کی کثرت پائی جاتی ہے مگر ان کے دوسرے افسانوی مجموعے میں انہوں نے اپنی ان کمزوریوں پر قابو پالیا ان کے افسانوں میں مشاہدے کی وسعت اور مطالعہ کی گہرائی نمایاں ہوتی ہے۔ ان کا یہ افسانہ شبو بھی اسی طرز کا ہے۔

ثمینہ سید نے مخصوص لوگوں کی زندگی کی عکاسی نہیں کی بلکہ ان کے یہاں مشترکہ موضوعات پر افسانے ملتے ہیں۔ ثقافت، مشترکہ تہذیب و تمدن اور مشترکہ قومیت نظر آتی ہے انہوں نے انسانوں کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی اور ان کے دکھ درد کو سماج معنویت عطا کی اور اپنے رومانوی طرز تحریر اور دلکش انداز بیان سے سماج کی کھوکھلی زندگی اور ان کے ظاہری عیش و عشرت پر طنز و تبصرہ کیا ہے۔

ثمینہ کا سادہ، خوبصورت اسلوب فنی پختگی کا حامل ہے جو افسانے کا منفرد مقام و مرتبہ متعین کرتا ہے۔ ثمینہ سید کی کہانی کا موضوع گھریلو معاشرت اور دیگر سماجی رہن سہن کی تصویر کشی کرتی ہے۔ ان کی کہانیوں میں معاشرتی ناہمواریوں کا کینوس خاصا وسیع نظر آتا ہے۔ زمانے کیسے ہوس ناکی کا نشانہ بنا۔ یہ سب اپنے افسانوں میں بیان کرتی ہے۔ سیمیں درانی کے موضوعات زیادہ پیچیدہ ہیں نسبتاً ثمینہ سید کے اور ان کی ہر کہانی موضوع کے اعتبار سے مختلف ہے موضوعات کا تنوع ان کے فن اور تحریروں کو اور جلا بخشتا ہے۔ ان کا افسانہ "ہم کہاں کے سچے تھے" ان کے افسانوی مجموعے "کہانی سفر میں ہے" کا پہلا افسانہ جس میں انھوں نے اس کائنات کے دو مرکزی کرداروں یعنی عورت اور مرد کی فطرت اور جبلت کی عکاسی کی ہے۔ نیناں اور زُہیر اس کہانی کے دو مرکزی

کردار ہیں۔ نیناں ایک کال گرل ہے جو سڑکوں پر اپنا رزق تلاش کرتی ہے۔ اور اپنے جسم کو ذریعہ معاش بنا کر زندگی گزار رہی ہے۔ زہیر عباس ایک مشہور صحافی جو محبت کے وجود سے انکاری شخص ہے۔ نیناں کی محبت میں اسیر ہو کر شادی کرتا ہے اور گھر بساتا ہے۔ اور پھر اس کے خوابوں کا محل چُور چُور ہو جاتا ہے۔

" زہیر کا مردہ وجود گاڑی روک کر اسے دیکھنے لگا یہ ضرورت ہے یا عادت نیناں؟ مردہ وجود سے آواز آئی، لڑکی دروازہ کھول کر اتر گئی۔ یناں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں "مجھے بھی آپ سے یہی پوچھنا ہے یہ ضرورت ہے یا آپکی عادت" وہ اتر کر پیچھے بھاگنے لگی "

(اقتباس: افسانہ، ہم کہاں کے سچے تھے)

عورت اور مرد اگرچہ قصے کہانیوں کے مرکزی کردار رہے ہیں فطرت کی دوسری چیزیں ضمنی کرداروں کی شکل میں آتی ہیں۔ کہانی کا تانا بانا ان ہی مرکزی کرداروں کے گرد گھومتا ہے۔ دونوں کی باطنی نفسیات اور ظاہری عمل کہانیوں کو جنم دیتا ہے۔ ثمینہ سید کے افسانوں میں "وفا بے وفائی، محرومی مجبوری، ازل سے ظلم سہنے والی عورت اور ظلم کرنے والا مرد، محبت کی راہ میں رکاوٹ بننے والا معاشرہ اور معاشرے کے استحصال سولی پر لٹکنے والی خاموش محبت" یہ سب ان کہانیوں کے موضوعات ہیں۔

"دوغلی"، "ہاتھ میرے خالی ہیں"، "تجھے سوچتے رہے" اور "بڑی عورت" اسی قبیل کے افسانے ہیں۔ جس میں عورت مرد اور محبت تین مرکزی کردار رہے ہیں۔ کہیں محرومی ہے کہیں مجبوری ہے اور کہیں خود آگہی کے دروا ہوتے ہیں۔

"دوغلی" ایک ایسی لڑکی کی کہانی جو بہن بھائیوں میں سب سے بڑی اور ماں باپ کی پہلی بیٹی ہے۔ جس کو پولیس کی نوکری کا جنون تھا ۔ گھر والوں کی مخالفت کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی تو حاصل کر لیتی ہے پر اس بات کی تاب نہ لاتے ہوئے اس کا باپ اس دنیا سے کوچ کر جاتا ہے تب اُس کو ہی مرد اور بیٹا بن کر میدان میں اُترنا پڑتا ہے۔ چھوٹی تین بہنوں اور ماں کی ذمہ داری نبھاتے نبھاتے کب بالوں میں چاندی اتری اُسے پتا ہی نہ چلا۔ سرمد انکم ٹیکس آفیسر تھا اور ایک کیس کے سلسلے میں تھانے آیا اور اُسے وہ لڑکی بھا گئی کب محبت نے ان کے درمیان جگہ بنائی اس بات کا احساس ہوتے ہی زندگی آسان لگنے لگی۔ عورت کی محبت کے موضوع پر یہ ایک بہترین کہانی ہے۔ اس سے ایک اور پہلو بھی ہے کہ عورت کے لیے ساتھ اور سہارا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس بات کا جب ادراک ہوا تو وقت ہاتھ سے ریت کی طرح سرک چکا تھا۔

" وہ سب کو بڑے دھڑلے سے کہتی تھی شادی کرنا مرد کی محکومی کرنا مجھے پسند ہی نہیں مجھے تو حیرت ہوتی ہے عورتیں کس طرح مردوں کی جرابیں، بنیانیں دھوتی ہیں۔ وہ بڑے فخر سے کہتی میں داسی نہیں بن سکتی۔" مگر درحقیقت وہ پوری عورت تھی۔ بے بس تمناؤں سے بھری ہوئی محبوب کی ایک جھلک کو ترستی ہوئی۔ اس کے اندر بھی مرد کی جرابوں بنیانوں کو سنبھال کے رکھنے کی حسرتیں روز روتی رہتیں۔ "(اقتباس: افسانہ، دوغلی)

بظاہر مضبوط نظر آنے والی عورت کے اندر وہ ہی عام سی لڑکی، خواب سجانے والی اور کمزور سی جسے سہارے کے لیے ہمیشہ سے مرد کی ضرورت ہے۔

افسانہ "ہاتھ میرے خالی ہیں" ایک ایسے خوب رو نوجوان کی کہانی ہے جس نے انتہائی غربت میں آنکھ کھولی اور جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی غربت کی دلدل سے باہر نکلنے کی کوشش میں شدید محنت کو اپنا ہتھیار بنایا، پھل فروش سے جوس کارنر تک کا سفر طے کیا اور ایک دن محبت کے تیر کا شکار ہو کر ایک کالا جادو کرنے والے عامل کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن گیا۔

" میرے دوست مجھے رشید بابا کے پاس لے گئے اور ساری کہانی من و عن اس کے سامنے رکھ دی وہ ہنسا اور میرے کاندھے پر ہاتھ مارا جیسے تسلی دی ہو وہ کچھ پڑھتا پڑھاتا رہا ہم کئی گھنٹے بیٹھے رہے۔ اس نے تعویز دھاگے دیئے کچھ چیزیں قبرستان میں جا کر درخت پر باندھنے والی دیں کہ اس کا دل اُڑے گا اور وہ میرے پاس آجائے گی۔" (اقتباس: افسانہ، ہاتھ میرے خالی ہیں)

ایسے عامل بابا معاشرے کے وہ ناسور ہیں جو بہت ساری زندگیوں کے ساتھ کھیل کر ان کو جیتے جی مرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ شاہد مرزا کو ماہ نور کے باپ کی دولت بھی مل گئی۔ سب کچھ حاصل ہو جانے کے بعد اُس کے اندر بے چینی اور بے قراری بڑھنے لگی جو اس احساس کا نتیجہ تھی کہ محبت کو دھوکے سے حاصل کیا۔ یہ اچھائی اور برائی کی جنگ تھی۔ ضمیر کے زندہ ہونے کی نشانی جو انسان کو اپنی عدالت میں کھڑا کر کے برائی کی طرف بڑھتے قدموں کو روکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

" میری کمائی تو کچھ بھی نہیں یار یہ سب تو ماہ نور کا ہے جو میں تم کو گوں کے ساتھ بانٹنے چلا آتا ہوں کہ شاید کسی کی دعا سے میرے بخت کی سیاہی دھل جائے۔" (افسانہ: ہاتھ میرے خالی ہیں)

افسانہ "تجھے سوچتے رہے" ایک ایسے جوڑے کی کہانی ہے جو خوشگوار اور خوشحال زندگی گزارتے ہوئے غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی زد میں آکر اپنے محور سے ہٹ جاتے ہیں۔ حق جتانے والا شوہر اور اپنے کیریئر کو آگے بڑھانے کے لیے مطالبہ کرتی ہوئی بیوی کی یہ کہانی ہے۔ ثمینہ سید نے یہ گھریلو موضوع پر افسانہ لکھا ہے جس میں میاں بیوی کے تعلق کو پیش کیا ہے۔

" وہ چپ رہا لیکن شام کی فلائیٹ سے اسلام آباد 'آگیا میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا' ہو بے بسی سے بولا تم میری نگرانی کرتے ہو بسمہ زور سے چلائی۔۔۔۔۔۔۔۔ تم ٹھیک نہیں کر رہی وہ ٹھہرے ٹھہرے تھکے لہجے میں بولا۔" (اقتباس: افسانہ، تجھے سوچتے رہے)

چھوٹی چھوٹی باتیں چھوٹے چھوٹے جھگڑے معاشرے کی سب سے مضبوط اکائی گھر کو بکھیر کر رکھ دیتے ہیں۔ لباس اور تن کے اس رشتے کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ میاں بیوی دونوں اس افسانے کے مرکزی کردار ہیں۔

ثمینہ سید کے چند مزید افسانوں کے موضوعات پر غور کیا جائے تو ان میں ان کا افسانہ "بڑی عورت" ایک بیوی کی وفا کی کہانی ہے جس کے لیے اُس کا گھر شوہر اور بچے ہی اس کی کل کائنات تھے۔ وہ اپنی ہی دنیا میں مست مگن شوہر کی پوجا میں مصروف اور مسرور

تھی ایک دن اُس کے خوابوں کا محل چکنا چور ہو گیا جب اُس کا یہ بھرم ٹوٹا کہ اُس کا محبوب شوہر کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو چکا ہے۔ وہ عورت اپنی اور اپنی بیٹیوں کی عزت اور تحفظ کی خاطر معاشرے میں مردانہ وار آگے بڑھتی ہے وکالت کی تعلیم حاصل کر کے اپنے پاؤں پر کھڑی ہوتی ہے۔

سوتیلے باپ کے منفی رخ سے آشنا کروایا گیا ہے کس طرح رشتوں کی سفید چادر کو میلی کرتے ہوئے باپ اور بیٹی کے مقدس رشتے میں ملاوٹ ہوتی ہے۔ عورت کسی بھی مقام پر پہنچ جائے، رہتی عورت ہی ہے اُس کے اندر کی نرمی اور محبت ہی اس کی مضبوطی اور کامیابی ہے۔

"کہانی سفر میں ہے" کی مرکزی کردار خود ایک لکھاری ہے۔ وہ اپنی کہانی کار دوست سے کہتی ہیں جب ہم کوئی کہانی لکھتے ہیں تو اس میں خواب، خواہشیں اور کسی قدر مبالغہ ڈالنا پڑتا ہے صرف صبر اور دکھ کوئی نہیں پڑھتا۔ جواب میں اس کی کہانی کار دوست کہتی ہے۔ " کہانی جھوٹ نہیں مانگتی ہمارے ساتھ سفر میں رہتی ہے۔ سفر کی صعوبتوں کو اور پیچ وخم کو سہتی ہے ہماری کیفیات کی عکاس ہوتی ہے۔"(اقتباس: افسانہ، کہانی سفر میں ہے)

اس افسانے میں انسانی نفسیات کی اس کیفیت کی عکاسی بہت خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ ہم کسی کے دکھ میں ہمدردی اور غمگسار بن کر اُس کو تسلی دینے میں تو سب سے آگے ہوتے ہیں لیکن وہی انسان اس غم سے ابھر کر اپنی زندگی کے اچھے دور میں داخل ہو کر خوشیاں سمیٹتا ہے تو ہم اُس کی خوشی میں خوش نہیں ہو پاتے۔

یہ دو الگ الگ خیالات کی حامل عورتوں کی کہانی ہے ایک صبر ضبط اور حوصلے کے ساتھ زندگی کی سچائی اور حالات کی سختیوں کو قبول کر کے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی ریاضتوں کا صلہ پا کر خوش بختی کی منازل طے کرتی ہوئی سرخرو ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف اپنی انا اور خود غرضی کے زعم میں اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پہ خود کو منوانے والی عورت جو آخر میں تہی دامن رہ جاتی ہے اسکا گھر بکھر کر رہ جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

" محبت زندہ رہنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ کائنات تخلیق ہیمحبت کے اصول پر ہوئی ہے۔ لیکن محبت صبر اور قربانی مانگتی ہے۔ ہر رشتے میں پوری توجہ اور مستقبل مزاجی چاہتی ہے ورنہ آپ خالی خولی یقین کے ہاتھوں کنگال ہو جاتے ہیں اور اپنی سچی خوشیاں اور رشتے گنوا بیٹھتے ہیں۔"(افسانہ: کہانی سفر میں ہے)

انسان کا خمیر بنیادی طور پر محبت کی مٹی سے گوندھا گیا ہے۔ خون کے رشتے جب دور ہوتے ہیں تو ہمارے جسم اور روح میں ایک خالی پن در آتا ہے اور وہی خالی پن خون کی بیماریوں کو جنم دیتا ہے۔ کسی انسان کی خود غرضی اور خود پرستی کب دوسرے کی جان لے لیتی ہے اسے پتا بھی نہیں چلتا۔ لیکن وہی بچے جب اس قابل ہوتے ہیں کہ ماں باپ کے لیے چھاؤں بن سکیں ان کو سہارا دے سکیں

ان کو بے یار و مدد گار چھوڑ کر اپنی الگ دنیا بسا لیتے ہیں۔ماں باپ کے اس کرب اور بے بسی کو اس کہانی میں بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے یہ بھی ہمارے گھریلو ماحول سے لیا گیا ایک موضوع ہے۔اقتباس ملاحظ فرمائیں:

" جج صاحب یہ سب اڑ گئے میں اور میری بیوی تنہا رہ گئے ہم نے یاسر کو باہر پڑھنے بھیجا تھا وہ بے وفا نکلا اس کی بے وفائی کو غافر کی شادی کر کے اس کی خوشیاں دیکھ کر کم کرنا چاہتے تھے مگر اس نے خود ہی شادی کر لی۔جناب عالیٰ ہم نے عامر کا سہارا لیا مگر وہ کب تک ہم بڈھوں کے پاس رہتا ہم ان کے ماں باپ ان کو زندگی دینے والے بہت پیچھے رہ گئے اتنے پیچھے کہ ہمارے بیٹے ہمیں بھول ہی گئے کہ ہمیں ان کی ضرورت ہے۔"(افسانہ: مقدمہ)

وکیل یہ سب سن کر کہتا ہے آپ یہ جذباتی ڈرامہ کر کے عدالت کا اور ہم سب کا وقت برباد کر رہے ہیں اب آپ ہی بتائیے عدالت کیا کرے تو بابا جی ہمت کر کے بولے پوتے مجھے دے دیں تاکہ، ہمارا دل لگا رہے۔

یہ موضوع ایک منفرد نوعیت کا ہے لیکن یہ ہمارے سماج کی عکاسی کرتا ہے۔چھوٹے چھوٹے دکھ جو روزمرہ کا حصہ ہیں وہ خوشیاں جو قاری کو زندگی کی طرف واپس لاتی ہیں، وہ نفسیاتی گرہیں جو قلم سے کھلتی ہیں، وہ کیفیات جن کا مدوجذر ہی حرکت اور تفسیر کا سبب بنتا ہے، انھیں سے ثمینہ کی کہانیوں کا خمیر اٹھا ہے۔اور یہی ثمینہ سید کی تحریروں کے خدوخال ہیں۔وہ افسانہ "میں طاہرہ" جیسے دل دہلا دینے والے مردانہ معاشرے میں عورت کے استحصال کی کہانی لکھتی ہیں۔تو دوسری طرف "عادت" جیسے افسانے میں زہیر کی کشادہ دلی اور نیناں کی بے راہ روی کا قصہ لکھ کر توازن پورا کر دیتی ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص نظریے یا نعرے کا علم پکڑ کر میدان میں نہیں آئی بلکہ وہ زندگی سے جڑی ہوئی قلم کار ہیں اور زندگی تحریر کرنے میں مگن ہے۔ان کا ہر موضوع حقیقت کے قریب اور سماج سے اخذ کیا ہوا ہے۔

" میں طاہرہ "میں مرد کے حاکمانہ اور عورت کو اپنی ملکیت سمجھنے اور اس کے ساتھ اپنی مرضی کا سلوک کرنے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔اس من مانی کے دوران عورت کس جسمانی اور ذہنی کرب سے گزرتی ہے اس کا اندازہ صرف وہی کر سکتی ہے۔یہ موضوع ایک عورت لکھاری ہی اچھی طرح بیان کر سکتی تھی اور واقعی ثمینہ نے اس کی بہترین تصویر پیش کی ہے۔

انسان جب اشرف المخلوقات کے درجے سے اُتر کر نیچے آتا ہے تو وہ ایک حیوان بن جاتا ہے جسے رشتوں کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔یا پھر گوشت نوچنے والا ایک گدھ جسے صرف نوچنے سے مطلب ہوتا ہے چاہے زندہ ہو یا مردہ، ہمارے معاشرے میں ایسے بے شمار گدھ ہیں جو اپنی ہوس کی بھوک مٹانے کی خاطر کسی کا معصوم بچپن کچلنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے اس افسانے میں مصنفہ نے اس کرب ناک حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے:

" وہ جھکی اور بولی، 'وہ کہتی ہے کہ اس کے خان چاچا بھی اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔اسے اور اس کی سہیلیوں کو باہر لے جاتے ہیں گھماتے پھراتے ہیں آئسکریم کھلاتے ہیں اور کئی گھنٹے اپنے پاس رکھتے ہیں اور پھر واپسی پہ پانچ سو روپے بھی دیتے ہیں۔میرا پورا

وجود کانپ رہا تھا۔ میرے کمزور وجود کے لیے یہ ایک بہت بڑا جھٹکا تھا۔ میں کوئی ردعمل پیش نہ کر سکی پھٹی ہوئی آنکھوں سے اس معصوم کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ جو بول رہی ہے اسے سمجھتی بھی ہے یا نہیں۔"

(اقتباس: افسانہ، میں طاہرہ)

بھوک ایک بہت دردناک حقیقت ہے پیٹ کی آگ انسان سے ایسے ایسے جرم کرواتی ہے جس کا سوچ کے بھی روح کانپ جائے پیٹ خالی ہو تو سارے فلسفے ساری تہذیب دھری رہ جاتی ہے۔ غریبی سے بڑا کوئی دکھ نہیں ہوتا اور غریب سے بڑھ کر کوئی مظلوم نہیں ہوتا۔ یہ تنگدستی اور غربت ہی تو ہے جو ایک ماں کو اپنا جسم بیچنے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی مجبوری کا فائدہ اٹھانے کو اس ظالم سماج میں بہت سے درندے پھر رہے ہیں۔

مزید المیہ یہ کہ بہت سے لوگ یہ سب جانتے بوجھتے بھی انجان بن کر اس معاملے کو حل کرنے کی بجائے پہلو تہی کرتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ اگر کوئی حوصلہ کر کے میدان میں اُترتا بھی ہے تو کوئی ساتھ دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ جب ایک عورت اپنے حق اور نسوانیت کی عزت کی خاطر کھڑی ہو جائے تو کوئی رکاوٹ اُسے انتقام لینے سے نہیں روک سکتی۔ عورت کی اس جرأت کو بھی افسانے میں مثبت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ثمینہ سید نے اس ایک افسانے میں کئی موضوعات کو سمو لیا ہے جس کا ہر زاویہ حقیقت کی عکاسی کرتا ہے فرقہ واریت اور مذہبی تعصب نے سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہوئی اس شدت نے مذہب اسلام کا اصل چہرہ ان فسادات کے دھوئیں کے پیچھے کہیں چھپا دیا ہے۔ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جو اپنے پیروکاروں کو امن اور سلامتی کا درس دیتا ہے۔ نومسلموں کو اعانت اور دلجوئی کے لیے اصول مقرر کرتا ہے تاکہ اُن کو دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد کسی قسم کی تکلیف یا پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے مگر نام نہاد مذہبی رہنما جو بھولے بھالے معصوم لوگوں کو بھڑکا کر فرقہ واریت کی آگ میں دھکیل کر خود ایمان کے گیت گاتے نہیں تھکتے۔

افسانہ "وہ کافر" ایک ایسے ہی نومسلم کی کہانی ہے جو پہلے لادین تھا جس کا کوئی مذہب نہ تھا۔ مائیکل نامی یہ لڑکا جو ایک مسلم لڑکی آمن سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں اپنے سارے خاندان سمیت داخل ہوا۔ اُسے اور اس کی ماں کو فرقہ واریت کی آگ نگل گئی۔ اس حساس موضوع پر بھی ثمینہ سید نے کہانی لکھی ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

" ہمارے مسلمان ہونے کی بڑی وجہ تم تھیں امن۔۔۔ تم ہی بتاؤ ہم سنی ہیں یا شیعہ یا پھر دہشت گرد؟ ہمارا مذہب اسلام کیا صرف مسلمانوں کا مذہب نہیں ہے؟۔۔۔ یہ شیعہ، سنی، وہابی، دیوبندی یہ سب کیا ہے تمہیں بتانا ہی ہو گا؟" (افسانہ: وہ کافر)

وطن کی محبت ایمان کا حصہ ہے تو ہم وطنوں کی ہمدردی اور انسانیت کی بھلائی مومن کی نشانی۔ بہت چنے ہوئے لوگ ہتے ہیں جو عظیم مقصد لے کر زندگی گزارتے ہیں اور بہت سارے لوگوں کے لیے مشعل راہ بن جاتے ہیں۔ "خوشیاں ٹی سٹال" ایک ایسے ہی محب

الوطن شخص کی کہانی ہے جو باہر ملک سے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اپنے وطن واپس لوٹ آیا تا کہ ٹوٹے ہوئے لوگوں کو سہارا دے سکے بے روزگاروں کو روزگار اور بھوک سے ستائے ہوئے لوگوں کے پیٹ بھرنے کا سامان مہیا کر سکے۔

رحمان عزیز نام کا یہ شخص جو خوشیاں بانٹنے نکلا تھا اس کی اپنی خوشیوں کو کسی سفاک کی اندھا دھند چلائی ہوئی گولیاں نگل گئیں اور آس پاس کی کیفیت میں زندگی کے دن پورے کرتا اسی آس پاس کسی ایسے شخص کے انتظار میں ہے جو اس کی خوشیاں ٹی سٹال کی رونقیں پھر سے واپس لانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

" ہمارے والدین نے ہمیں پڑھایا لکھایا پھر باہر بھیج دیا لیکن رحمان کو پاکستان سے بڑی محبت تھی۔ یہ واپس لوٹ آیا اور یہاں سڑک کے اس ویران گوشے پر یہ خوشیاں ٹی سٹال آباد کر لیا یہ رونقیں تو بہت بعد میں آئیں۔ رحمان کو نوکری کرنا پسند نہیں تھا اس لیے یہ خیال اس کے ذہن میں آیا۔" (اقتباس "افسانہ، خوشیاں ٹی سٹال)

بھوک ایک تلخ حقیقت ہے، بے روزگار شخص بھوک اور مایوسی میں زندگی سے کنارہ کرنے کا سوچتا ہے۔ یہ پہلو بھی اس کہانی میں پیش کیا گیا ہے۔

ثمینہ سید کی ہر کہانی دوسری سے الگ اور ہر موضوع نیا ہے بے شک مواد اپنے ارد گرد کے ماحول سے ہی لیا گیا ہے لیکن موضوعات دل کو چھو لینے والے ہیں۔

ثمینہ سید کا افسانہ "زہر رگوں میں اتار کر" ان کے افسانوی مجموعے ردائے محبت کا پہلا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی ایک بیماری یعنی ایچ آئی وی پازیٹو جس سے ایڈز کے خدشات بڑھ جاتے ہیں، کا ذکر کیا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں چونکہ بہت زیادہ منافقت پائی جاتی ہے اس لیے ہم ایسی بیماریوں کو قبول ہی نہیں کر پاتے کہ ایسی بیماری کا وجود بھی ہو سکتا ہے۔ ہم مستقل ایک انکار کی ذہنیت میں گم رہتے ہیں کہ یہ مغرب والوں کی بیماری ہے ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب کہ حقیقت تو کچھ اور ہی بتائی ہوئی نظر آتی ہے کہ ہمارا زعم پاکبازی ہمیں آنکھیں میٹ کے ایسے لوگوں اور رویوں کے بارے میں انتہائی معتصب بنا دیتا ہے۔ ثمینہ نے ایسے موضوع کا انتخاب کر کے ایک اہم فریضہ سر انجام دیا ہے۔

یہ ہمارے سماج کی ایک مجبور لڑکی کی کہانی ہے جو ایسے حالات کی ماری ہوئی ہے کہ ان جیسی لڑکیوں کی زینت الزامات ہی بنتے ہیں۔ پناہ گاہ کے طور پر بھی زمانے کی بدنام گلیاں ہی نصیب ہوتی ہیں۔ جہاں پر شریف اور عزت دار لوگ رات کے اندھیرے میں اپنی شرافت کا چولا اتار کر بڑی شان سے بیٹھتے ہیں یہ مکروہ چہرہ مصنفہ نے افسانے کے ذریعے عیاں کیا ہے۔

ثمینہ کے افسانوں کو اگر فن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان میں مختلف عناصر پائے جاتے ہیں مثلاً خود کلامی کا طرز، یہ طرز ان کے پہلے افسانوی مجموعے "ردائے محبت" میں زیادہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں صحافتی طرز اور داستانی عناصر بھی کہیں کہیں ملتے ہیں۔

جہاں تک دونوں خواتین افسانہ نگاروں کے فنی معیار کا تقابل ہے تو ثمینہ سید کے یہاں ایک مضبوط پلاٹ، بہترین منظر کشی، اعلیٰ کردار نگاری دیکھنے کو ملتی ہے ان کا ہر کردار ہمارے سماج کا نمائندہ معلوم ہوتا ہے۔ ثمینہ سید کا اسلوب بھی بہت سادہ اور عام فہم ہے۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ مضبوط واقعات سے مزین ہیں۔ افسانوں میں کہانی پن بہت متاثر کن ہے۔ منظر نگاری بھی کمال کی ہے چھوٹے چھوٹے جزیات کو بڑی ہنر مندی سے پیش کیا گیا ہے۔

ثمینہ سید کی کتاب کے مطالعے کے دوران قاری ایک ایسے سفر پر روانہ ہوتا ہے جو انفرادی دکھ سے لے کر زمانوں کی نوحہ گری تک بے کراں ہے۔ ان کے افسانے گھروں میں بسنے والی مشکل اور آسان، پیچیدہ اور تہہ در تہہ دنیا میں لے جاتے ہیں۔ ان کی کہانیاں انسان کے سب سے اوّلین ماحول یعنی اس کی گھریلو زندگی سے جنم لیتی ہیں۔ وہیں جنم لینے والی محبتوں، لاتعلقیوں، خوبصورتیوں اور کراہتوں کے افسانے ہیں۔ اور ان سے کون آگاہ نہیں ہے اکثر لکھنے والے ان سے پہلو تہی کر جاتے ہیں اور بیرونی موضوعات سے مواد اکٹھا کرتے ہیں۔ افسانہ "درد گر آدمی ہوتا" میں انہوں نے بہنوں کے درمیان ہونے والے جذبہ رقابت کا ذکر کیا ہے جسے نفسیات دان Sibling Rivalry کہہ کر پکارتے ہیں کا ذکر بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ دیکھنے میں یہ موضوع بہت غیر معمولی محسوس ہوتا ہے، لیکن یہی تو بات ہے اس دنیا میں آخر کیا نہیں ہوتا۔

زندگی دکھ سکھ کا حسین امتزاج ہے بعض اوقات تو صرف غم ہی غم انسان کا مقدر بنتے ہیں خوشی خال خال ہی نظر آتی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی انسان حوصلے کا دامن پکڑ کر خوش مزاجی کو اپناتا ہے تو لوگ اسے بھی تعجب سے دیکھتے ہیں۔ یہ افسانہ اسی موضوع پر ہے۔ مصنفہ کا مشاہدہ گہرا، احساس کی حس تیز اور نگاہ باریک بین ہے وہ ایک مشاق بھنورے کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کے پھولوں سے اپنی کہانی کا رس کشید کرتی ہیں اور پھر اسے کامیابی سے صفحہ قرطاس پر رقم کرتی ہیں یہ ثمینہ سید کا کمال فن ہے۔

کہانی "وفا اس کب ہے" میں سیاسی طور پر کامیاب اور معاشی طور پر مضبوط طبقے کے مردوں کی گری ہوئی معاشرتی اقدار مثلاً ملازماؤں کے ساتھ تعلقات کے موضوع کو چھیڑا ہے جو اس قسم کے طبقے کے منہ پر ایک قسم کا چانٹا ہے۔ انھوں نے اس قسم کے استحصال کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اسی افسانے کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

" وقت کے ساتھ ساتھ اسے سمجھ آ رہی تھی کہ اس کا خاندان ایک دوہری زندگی جی رہا ہے نانا جی، ماموں اور ان کے بیٹے سب کے سب مرد کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں اب کی بار وہ بڑی حویلی آئی تو حیران رہ گئی اس کے کزنز گھر کی نوکرانیوں کے ساتھ عجیب طرح کے تعلقات تھے" (وفا اس کب ہے، ص ۷۲)

ان کا افسانہ "انشورنس" اور "جنت دو قدم پر" بھی اسی موضوع پر ہیں کوئی نشانہ بناتا ہے اور کوئی نشانہ بنتا ہے مگر اس سارے گھناؤنے عمل کے پیچھے جو درندے ہیں جو اس سفاک عمل کو انجام دینے کے لیے معصوم جانوں کو استعمال کرتے ہیں ان کی مجبوریاں خریدتے ہیں۔ ان تک کسی کی رسائی نہیں ہو پاتی یا پھر سب دیکھتے ہوئے بھی انجان بن جاتے ہیں۔ "دھرتی بانجھ نہیں

ہوتی" "ردائے محبت" "اور بنت حوّا" میں عورت کی وفا، ان افسانوں میں ممتا اور محبت کے موضوعات پر بہت اچھی طرح سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

عورت کے کئی روپ ہیں ہر روپ دوسرے سے الگ نرالا اور اچھوتا ہے۔ مگر بنیاد ایک ہی ہے عورت ایسے ہر روپ میں محبت اور وفا کی مورت ہے۔ ایثار، قربانی وفاداری اس کے خمیر میں گندھی ہوئی۔ عورت کو نہ سمجھنے والے لوگ اکثر یہ بات بھول جاتے ہیں کہ صنف نازک کے اندر بھی اس کو بنانے والے خالق نے دل رکھا ہے جو سب سے پہلے عزت کا طلبگار ہوتا ہے۔ عورت دھرتی کی مانند ہے انسان کے سارے دکھ سمیٹ کر اسے اپنی پناہوں میں لے لیتی ہے مگر اپنی پامالی اور ناقدری کو معاف نہیں کرتی۔

"ردائے محبت" ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو تخلیقی صلاحیتوں سے مالامال ہوتی ہے مگر اس کی اس صلاحیت کو قدردان نہیں ملتا اس کا شوہر اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ تو وہ بغاوت پر اُتر جاتی ہے۔ اور طلاق کا مطالبہ کر دیتی ہے پھر خود کو تعلیم سے آراستہ کر کے دوبارہ ایک نئے ساتھی کے ساتھ گھر بساتی ہے۔

" مجھے طلاق دے دو" وہ خشک لہجے میں بولی تمہیں یہاں کس چیز کی کمی ہے؟ محبت کی۔۔؟ جس محبت کی تلاش میں وہ نکلی تھی ہو پھر بھی اس کا مقدر نہ بن پائی۔" اُسے اپنی تمام کشتیاں جلی ہوئی نظر آرہی تھیں مگر اب فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا پروفیسر وجدان حیدر کے گھر کی صبح وشام ہی نرالی تھی۔ گہری خاموشی بس کبھی کبھی پروفیسر صاحب پوچھ لیتے تھے "تم خوش ہو"؟

(اقتباس: افسانہ، ردائے محبت)

" بنت حوّا" شوہر کی محبت میں مگن ایک عورت کی کہانی ہے جس کے لیے اسکی کل کائنات اس کا شوہر اور گھر کی چار دیواری تھی مگر پھر کوئی اور اس کی زندگی میں نقب زن بن کر داخل ہوا اور اس کی دنیا آندھیوں کی زد میں آگئی اس افسانے میں عورت کی نفسیات کو بیان کیا ہے عورت چاہے لاکھ انکار کرے مگر وہ محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ پاتی۔ یہ ازل سے ہوتا آیا ہے اور ایسے ہی چلتا رہے گا۔

" پھر میں نے ایاز کو معاف کر دیا اور شاید مجھے لگا جو میں بولتی ہوں عورتوں میں مرد کے خلاف جو نفرت دھیرے دھیرے بو رہی ہوں وہ غلط ہے میرے تو اپنے اندر اپنے مرد کے لیے نفرت ہے ہی نہیں میں تو آج بھی ایاز سے شدید محبت کرتی ہوں وہ آج بھی ہر لمحہ میرے ساتھ ہے۔"

(اقتباس: افسانہ، بنت حوّا)

"دھرتی بانجھ نہیں ہوتی" یہ افسانہ ایک عورت کی وفا کی داستان جو شوہر کی محبت میں زمانے بھر کی باتیں اور گھر والوں کے طعنے سنتے ہوئے بھی کسی پر شوہر کی کمزوری کو عیاں نہیں ہونے دیتی اولاد کے لیے کبھی بھی اپنے شوہر مورد الزام نہیں ٹھہراتی بلکہ ایک اچھی

سوچ کو جنم دیتے ہوئے بے سہارا یتیم بچوں کو سہارا دیتی ہے اور دھرتی کی گود سے اپنا دامن خوشیوں سے بھرتی ہے۔ اس افسانے کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

" اگر ایک پل کو سوچیں اور غور کریں تو ہماری زندگی کی اس بڑی کمی میں شاید اللہ کی کوئی مصلحت چھپی ہو۔ شاید ہمیں ان پیارے بچوں میں سے کسی کو گھر لا کر اپنے گھر کو رونقیں دینا ہوں۔ شاید آج ہم ان کا سہار بنیں تو کل وہ ہمارا سہارا بن جائیں ہمارے بڑھاپے کا سہارا۔"

(افسانہ: دھرتی بانجھ نہیں)

افسانہ "پارسائی" ایک ایسے شوہر کی کہانی جو بیوی کو محبت نہیں ملکیت سمجھ کر ہر وقت اس پر پہرے بٹھاتا ہے اور اس کے اعتماد اور اعتبار کا خون کر دیتا ہے۔

" پرانے زمانے میں مرد کہیں باہر جاتے تھے تو اپنی بیوی کو لوہے کا لباس پہنا کر بھاری تالا لگا دیتے اور چابی ساتھ لے جاتے وہ ہنی ، کلیم چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا یہ مرد کی محبت کی شدت ہی تو تھی۔ وہ بولا تو آمنہ پہلی بار چونکی "کلیم یہ محبت نہیں تھی بے اعتباری تھی، محبت محض جسم سے نہ باندھ پائے تو پھر ممکن ہی نہیں کہ وہ عورت کو کسی کام سے روک سکے۔ آدم اور حوا کی اس کائنات میں رشتوں کے لیے محبت کا لاک ہی کافی ہے۔"

(اقتباس: افسانہ، پارسائی)

"قلت حیلت" جاگیر داری نظام کے منہ پر طمانچہ ہے عورت پر جائیداد بچانے کی خاطر جو ظلم کیا جاتا ہے اس کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ خاندان میں جوڑ نہ ہونے کی صورت میں عمر بھر کے لیے کنواری بٹھایا جاتا ہے تو کبھی قرآن سے شادی کر کے اس کی زندگی بے رنگ کر دی جاتی ہے۔ اپنی انا کا علم بلند رکھنے کے لیے باپ اور بھائی کسی انسان کا قتل کرنے سے چوکتے ہیں نہ ہی معصوم بیٹیوں کی آرزوؤں کا گلا دبانے مین ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔

" زیبی تیری خوشیاں خالص نہیں تھیں ہمیں تو پہلے ہی دھڑکا تھا ان بہروپیوں پر ذرا بھی یقین نہیں تھا میری بچی تو بھروسہ میں ماری گئی۔" (اقتباس: افسانہ، قلت حیلت)

ثمینہ سید نے احساس کی شدت کو بہت گہرائی سے بیان کیا ہے ان کے کردار ایک دوسرے کے قریب قریب ہی محبت، نفرت، جدائی، ہجر و وصال، امید و یاس کے تانے بانے میں سانس لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کہانیوں کی زیریں لہر ایک گہرے کرب اور آشوب کی غمناکی سے عبارت ہے۔ درد کی یہ لہر ان کی ہر کہانی میں محسوس ہوتی ہے۔

افسانہ "ہیرو" ایک ایسے لڑکے کی کہانی ہے جو بچپن میں ہی ماں باپ کی چھاؤں سے محروم ہو گیا اور پھر اس کی پرورش اس کی سگی خالہ نے کی جس میں بچے کی بھلائی سے زیادہ اپنا مفاد پیش نظر تھا۔

" وہ جو حکم پر حکم مانتا گھوم چکا ہوتا اس آخری حکم پر نہال ہو جاتا اور شوال کو سینے سے لگائے ادھر اُدھر گھومتا رہتا اس کی ساری تھکن رفو چکر ہو جاتی وہ جیسے جیسے کھلکھلا کر ہنستی ہو نثار ہوتی نظروں سے دیکھتا۔ پانچ سال کا ہی تو فرق تھا دونوں میں لیکن وہ اندر سے خاصا بڑا ہو گیا تھا اس نے وقت سے پہلے ہی بہت سی ذمہ داریاں اٹھالی تھیں۔" (اقتباس: افسانہ، ہیرو)

اس کو ہیرو بننے کا بہت شوق تھا وہ خیالوں کی دنیا میں خود کو ہیرو تصور کر کے پھولے نہ سماتا۔ گزرتے وقت کے ساتھ شوال کی محبت نے اس کے دل میں ڈیرے ڈال لیے اور پھر اس کی خوشی کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے کر وہ امر ہو گیا اور سچ میں ہیرو بن گیا۔ آفتاب احمد جو حاشر کو موت دے کر اپنی کہانی کا ہیرو بننا چاہتا تھا اب حاشر کی موت کو گلے لگا کر امر ہو گیا۔

افسانہ "یہ میرا جنون" ایک بھائی کی بے وفائی اور دوسرے بھائی کے بدلے کی بھینٹ چڑھ جانے والی معصوم لڑکی کی کہانی ہے جس کی ساری عمر رشتے سنبھالنے میں گزر گئی اور جب خوشیوں میں حصہ لینے کی باری آئی تو انتقام کی آگ میں اس کی اپنی زندگی راکھ بن گئی۔ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے دشمنی اور انتقام کی آگ میں کئی زندگیاں برباد ہوتی ہیں معاشرہ عورت سے جینے کا حق بھی چھین لیتا ہے بنا اس کا قصور جانے مجرم قرار دے کر عمر بھر کی سزا اس کا مقدر بنا دی جاتی ہے۔

"شبو" ایک مجبور جوان لڑکی کی کہانی ہے جو اپنے بیمار باپ اور چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کی خاطر جھوٹ کے سہارے زندگی کو سہار دینے کی کوشش کرتی ہیں۔ پڑھی لکھی باشعور لڑکی کی کہانی جو جانتے بوجھتے ہوئے بھی دوغلے معیار کی زندگی گزار رہی تھی۔ اور عورت ہونے کی توہین کر رہی تھی جھوٹ بول کر لوگوں کو روغلا کر پیسے لیتی ہے۔

"معافی نہیں مل سکتی" ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو سات بہنوں میں سے ایک تھی جس سے سب بہنوں اور ماں کو بھائی اور بیٹا بن کر سہارا دیا اور اس معاشرے میں اپنا سہارا بھی خود بنی۔ جب مرد محبت کا دھوکہ دے کر عورت کو بے وقوف بناتا ہے تو عورت کو کمزور ہو جاتی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

" مجھ سے بات کرو میں خدا اور رسول کو گواہ بنا کر کہتا ہوں میرا تم سے رشتہ ہے کوئی گہرا تعلق۔ میں پیچھے نہیں ہٹوں گا لیکن تم جواب نہیں دو گی تو خودکشی کر لوں گا۔ جو اپنا خیال نہیں رکھ سکتا وہ کسی دوسرے کا خاک خیال رکھے گا۔ فریال نے بے اختیار لکھا اور میسج بھیج دیا۔" (افسانہ: معافی نہیں مل سکتی)

مرد عورت کی ہار کو اپنی کامیابی تصور کرتا ہے اور عورت کو اپنی عزت نفس بہت عزیز ہوتی ہے جب عزت نفس مجروح ہوتی ہے تو وہ بے موت مر جاتی ہے اسکا بھرم اسکے اصول اور اسکا اعتماد جب ان کو ٹھیس لگتی ہے تو وہ اندر باہر سے ختم ہو ثمینہ سید کے موضوعات اور پلاٹ میں ایک شائستگی اور لطافت کا احساس ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے پڑھنے والا کہانی کے ساتھ پر سکون سفر کر رہا ہے انہوں نے ممنوعہ موضوع پر بھی لکھا ہے لیکن لطافت کا دامن نہیں چھوڑا بلکہ ان کا فن مزید نکھر کر سامنے آتا گیا ہے۔ اس ضمن میں معرف فکشن نگار نیلم احمد بشیر لکھتی ہیں کہ:

" ثمینہ سید آج کے دور کی تعلیم یافتہ حقائق سے آگاہ، سنجیدہ افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے کسی فرضی دنیا میں کھولی لہذا وہ بڑی بہادری سے ممنوعہ موضوع پر لکھ رہی ہیں اور اپنے قارئین کو متاثر کر رہی ہیں۔ مجھے قومی امید ہے کہ ثمینہ کا فن وقت کے ساتھ ساتھ مزید نکھر تا چلا جائے گا اور وہ دنیائے ادب میں کامیابی سے ایک کے بعد دوسرا قدم رکھتی منازل طے کرتی جائیں گی "

(نیلم احمد بشیر (مضمون) "حکایات خونچکاں "مشمولہ: ردائے محبت)

ثمینہ سید نے سماج سے روزمرہ کے موضوعات کو چن کر افسانے میں پیش کیے ہیں ان میں ایک لاشعوری تسلسل اور موضوعات میں تنوع اور بوقلمونی رنگ پایا جاتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کی مختلف شکلوں کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں اسی حوالے سے معروف فکشن نگار بانو قدسیہ، ثمینہ کے افسانوں کے بارے میں فرماتی ہیں کہ:

" میں خوش ہوں اور بہت مطمن بھی کہ نثر لکھنے والی عورتوں میں یہ نام ثمینہ سید پوری انسانیت اور زمانہ سازی لیے ابھر کر سامنے آرہا ہے۔ ثمینہ سید کا سفر تسلسل لیے ہوئے ہے۔ موضوعات میں تنوع ہے ارتقاء ہے صد شکر ہے کہ جمود نہیں۔ میں نے ثمینہ کا ہاتھ پکڑ کر دل کی ہوری سچائی سے کہا یہ سفر رکنا نہیں چاہیے میں تمہارا نام ادب کے چند نمایاں ناموں میں دیکھتی ہوں"(فلیپ: کہانی سفر میں ہے)

ثمینہ سید کے موضوعات ہر رنگ کے ہیں لیکن ان میں ایک روایتی افسانہ نگاری کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ تنوع کے باوجود اسلوب میں سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ روایت کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کے موضوعات سماج کی اکثریت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

تبصرے

"گونجتی سرگوشیاں" کی گونج

نعمان نذیر

دور حاضر میں تانیثی تھیوری، تانیثی تنقید غالب موضوعات میں سے ہے۔ جس کی بنیاد زیادہ تر ایک رواج عام کی سی بن گئی ہے ۔بہت غیر متعلقہ موضوعات اور بحثوں کو تانیثیت کے ساتھ جوڑا جارہا ہے۔ یہ تو رہی صورتحال تنقید کی۔اب تخلیق کی بات کی جائے تو یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہمارے ہاں اس ضمن میں تخلیقات کی صورتحال کیا ہے؟خوین قلم کار اپنے آپ کو مردوں کے قائم کردہ ڈسکورس سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوئی ہیں؟اور اس کا جواب ہاں میں ہے تو اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ اس بندش کو توڑنے کی نوعیت کیا ہے؟کیا وہ محض ضد کا رویہ رکھے ہوئے ہیں اور عورت کا بیان ایسی صورتحال میں کر رہی ہیں جو عورت کے استحصال پہ ختم ہو ساتھ ہو ہو یا واقعی اپنی ذات یا ہم جنسوں کے جذبات کی عکاسی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ محض عورت کے ساتھ ہونے والے استحصال کے بیان کا نام ہی تانیثی شعور نہیں، کہ اس کی مظلومیت کی داستانیں رقم کر کے ہمدردی کے وقتی جذبات وصول کرے بلکہ اس کردار کو ایک مکمل کردار گروپ میں بھی دکھانا چاہیے کہ ان کو پڑھ کہ روایتی لاچارگی کے بجائے ہمت کی مثال بھی قائم ہو۔

اردو افسانے کا شمار اردو کی اہم اصناف میں ہوتا ہے دور حاضر میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ جہاں انسان کے پاس خود کے لئے بھی وقت نہیں ہے۔خواتین قلم کاروں نے بھی اس میں اہم اضافے کیے ہیں۔اسی تناظر میں اپنی نوعیت کی ایک منفرد تحریر "گونجتی سرگوشیاں" کے نام سے منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں سات افسانہ نگاروں کے افسانے شامل ہیں۔ یہ ساتوں خواتین افسانہ نگار ہیں جن کا تعلق مختلف علاقوں، سماج اور شعبوں سے ہے۔کتاب میں ان سات خواتین کے 135 افسانے شامل ہیں۔مرتبین میں فرحین خالد اور صفیہ شاہد ہیں جو مصنفین میں بھی شامل ہیں۔ یہ دونوں افسانہ نگار افسانے کے فنی لوزام سے بخوبی آگاہ ہیں۔باقی افسانہ نگاروں میں ابصار فاطمہ کا تعلق سندھ اور ثروت مجیب کا تعلق کابل افغانستان سے ہے۔ ابصار فاطمہ ماہر نفسیات بھی ہیں۔اندرون سندھ سے تعلق کے باعث وہ وہاں کی عورت کی سماجی اور نفسیاتی صورت حال سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ثروت نجیب کے افسانوں میں افغانستان کے بدلتے ہوئے سیاسی سماجی تناظرات سے لے کر قدامت پسند رواجوں اور رسومات کے تناظر میں عورت کی زندگی کا بیان ملتا ہے۔ معافیہ شیخ، فاطمہ عثمان اور سمیرا ناز جدید عہد کی نمائندہ افسانہ نگار ہونے کے ناطے جدید عہد میں عورت کے ماضی وحال کے مسائل کو زیب قرطاس کرتی ہیں۔

ان افسانہ نگاروں کے افسانوں میں عورت کی بے بسی کی تصویر ہی پیش نہیں کی گئی بلکہ اس کے کردار کو ایک عام کردار کی طرح دکھایا گیا ہے۔ عورتوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ ان کی نفسیات کی کیفیت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ صفیہ شاہد کا افسانہ "طیب" میں

عورت کو مظلوم نہیں بلکہ بظاہر قصوروار لیکن در پردہ بے جا پابندیوں کے خلاف اٹھنے والی آواز کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ فر حین خالد کا افسانہ "ڈبل ایکس ایل" میں عورت کو انسان سے زیادہ ایک ڈیکوریشن پیس کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ معاشرہ اس میں موجود کسی کمی کی وجہ سے اسے رد کرتا ہے تو حسن کی صورت میں ہمہ تن استحصال کو تیار۔ جس کی وجہ سے عورت مختلف نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

فاطمہ آسمان کے افسانے "مجرا" میں عورت کا مختلف حالت میں استحصال دکھایا ہے۔ جہاں مفت علاج میں ڈاکٹر، انصاف کی امید میں وکیل اور مجروح کرنے والی سیاست دان استحصال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس استحصال کی نوعیت محض جنسی ہی نہیں بلکہ ایک کمزور کے طور پہ ہر طرح کا استحصال کیا جاتا ہے۔ 135 افسانوں پہ مشتمل اس کتاب میں نازک اور حساس موضوعات پہ بات کی گئی ہے۔ عورت کی نمائندگی بہ طور ادیب ادب میں ایک اہم اضافہ اور اس روایت کو مستحکم کرنے کی ایک عمدہ کاوش ہے۔

ڈاکٹر سکندر حیات میکن کی تحقیقی و تنقیدی کتاب "ادبی ستارے پر ایک اجمالی نظر۔۔

وجیہہ ضمیر

تحقیق ایک دقیق کام ہے۔ جس میں ہم پر وہ آشکار ہوتا ہے جو ہم سے مخفی ہوتا ہے یا کسی چیز کی اصل تک پہنچنا یا پھر اس اصل کے قریب قریب تحقیق پہنچا دیتی ہے۔ قرآن پاک کہتا ہے کہ مفہوم ہے کہ جب فاسق تم تک کوئی خبر لائے تو اس کی خوب تحقیق کر لیا کرو "یعنی غور و فکر کرنا اسلام میں پسند کیا گیا ہے

اگر ایک کام پر تحقیق کی جائے تو ضروری نہیں اس تحقیق سے اخذ شدہ نتائج حتمی ہوں بلکہ ایک موضوع پر ہر پہلو سے الگ مطالب و مفاہیم ہم تک پہنچ سکتے ہیں بلکہ پہلے کی گئی تحقیق سے راہیں ہموار ہوتی ہیں

نت نئے ادبی گوشوں کو متعارف کروانا بعض لوگوں کا جنون ہوتا ہے اور یہ ہی ادب میں کسی کام کرنے کا محرک بھی ہوتا ہے ورنہ ادب میں تو جمود طاری ہو جائے، ڈاکٹر سکندر حیات میکن کسی تعارف کے محتاج نہیں آپ تحقیق کے معاملے میں ادبی قارئین کے سامنے کوئی نا کوئی پوشیدہ پہلو ڈھونڈ نکالتے ہیں جس کی وجہ سے مختلف محققین اور ادب کے قارئین کے لیے راہیں ہموار ہوتی ہیں ابھی حالیہ ان کا ادبی کارنامہ "ضیابار افراد کے خطوط "بنام اصغر علی (علی گڑھ) پر تربیت پایا ہے اور کیا ہی شاندار کھوج نکالا ہے۔ یہ انسان کی مسلسل اور انتھک کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ شخصیت سازی کو ایک کوزے میں بند کرنا بخوبی جانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک زندہ شخصیت کو کس تناظر میں بیان کیا جاتا ہے ورنہ بڑے بڑے محقق زندہ ادبی شخصیات پر تحقیق کرنے سے گھبراتے ہیں۔

ان پی ایچ ڈی کا مقالہ کا عنوان, اردو میں ادبی تحقیق آزادی کے بعد, ہے۔

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کم عمری میں ہی شہرت آپ کے تعاقب میں لگ جائے یہ مقام دو صورتوں میں حاصل ہو سکتا ہے یا تو پھر محنت کے بل بوتے پر یا پھر خداداد صلاحیتوں کی بنا پر۔

ڈاکٹر سکندر حیات میکن 3 جون 1983 کو پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم کی بات کی جائے تو انہوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی اردو کر رکھی ہے جن نامور شخصیت کے پاس انہوں نے مقالہ کیا ان کا نام محترم ناصر عباس نیر صاحب ہے۔ ان کی پی ایچ ڈی کا عنوان "اُردو میں ادبی تحقیق آزادی کے بعد" ہے یہ مقالہ 5 ابواب میں الگ الگ 5 کتب کی صورت میں چھپ چکا ہے

ڈاکٹر سکندر حیات میکن سن دوہزار نو سے گورنمنٹ کالج شاہپور صدر میں بطور لیکچرار اردو خدمات سرانجام دے رہے ہیں انہوں نے جن موضوعات پر تحقیقی کام کیا ان کی فہرست بنانا قدرے مشکل ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے "کندن چہرے" میں ان کی شخصیت کا ذکر کیا ہے جبکہ ان پر ڈاکٹر انور سدید خاکہ لکھ چکے ہیں

۔ تحقیق کرنا نت نئے موضوعات پر کھوج لگانا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے ان کی تحقیقات میں

عطاء الحق قاسمی: شگفتہ مسافر،

حکم اذاں (کالم) مرتب

جامعاتی تحقیق: چند اہم زاویے،

بحر ارب کے دوشناور،

اردو میں سوانحی تحقیق (نمائندہ موضوعات کا مطالعہ و جائزہ)

افسانوی نثر پر تحقیق (آزادی کے بعد)

اردو شاعری پر تحقیق (آزادی کے بعد)

تحریکات و تنقیدات پر تحقیق (آزادی کے بعد)

غیر افسانوی نثر پر تحقیق (آزادی کے بعد)

تنقیدی و تخلیقی ستارے (خصوصی مطالعہ ڈاکٹر ناصر عباس نیر) جیسی کتب نمایاں ہیں۔

ان کی کتاب "تنقیدی و تخلیقی ستارے" (خصوصی مطالعہ ڈاکٹر ناصر عباس نیر) 2021 کو شائع مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ آمین پور، فیصل آباد والوں نے شائع کی یہ کتاب انہوں نے اپنے استاد محترم کی عقیدت میں رقم کی ہے۔ ناصر عباس نیر نو آبادیاتی مطالعہ کے بنیاد گزار ہیں۔ لفظ و معنی کے تعلق سے بخوبی واقف ہیں ان کے افسانوں میں رومان میں ایک محرک ہے جو انسان اپنی نظروں میں محسوس کر سکتا ہے عوامی انسانوں کے دکھ کو محسوس کرنے والے ہیں وہ ہنسنے والوں کے ساتھ ہنستے ہیں اور رونے والوں کے ساتھ روتے ہیں ایک لکھاری دور اندیش ہوتا ہے جو خود کو سماج کا آئینہ دار سمجھتا ہے ناصر عباس نیر کا اسلوب مشکل ہے مگر تخلیق کے جوہر پڑھنے سے کھولتے جاتے ہیں وہ قاری کو ٹھہراو کا کہتے ہیں اس مقام پر رکو تاکہ تیزی کی بنا پر ان کی نظروں سے ادبی جواہر اوجھل نہ ہو جائیں نو آبادیات اور جدیدیت کے مطالعہ پر وہ ید طولی رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے جس طرح ان کی شخصیت سازی پر قلم چلایا ہے وہ ایک مشاہدے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے جن محققین اور ناقدین کی آراء سے اس کتاب کو زینت بنایا ہے اس کی بناوٹ میں خوبصورتی پیدا ہوتی ہے ناصر عباس نیر کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوی ادب اور تنقیدی شعور کو بحث بنایا گیا ہے۔ انہوں نے اردو تنقید کو اس قدر تقویت بخشی ہے کہ وہ اس کو مغربی تنقید کے مقابلے میں لا کھڑا کرتے ہیں اور یہ مطالعہ کے بغیر نہ گریز ہے ان کے ہاں مشرقی و مغربی جمالیات کی فضا موجود ہے انہوں نے تنقید کے دامن کو وسعت بخشی ہے اس زمرے میں سکندر حیات میکن رقم طراز ہیں کہ

"ناصر عباس نیر فکر اور دانش کے حسین امتزاج کا نام ہے انہوں نے مغربی تنقید اور خیالات کے ساتھ اردو تنقید کے تفکرات سے خود کو آگاہ کیا ہے نے لسانی مباحث اور نئی تنقیدی تھیوریوں اور تنقیدی رجحانات اور انکے گہرے تخلیقی اور تنقیدی شعور کا ثمر ہے"

ان کے ہاں روایت سے جڑت ہے وہ روایت سے انحراف نہیں کرتے بلکہ روایت سے جڑی ہوئی افکار کو وہ اپنے افسانوں کا بھی موضوع بناتے ہیں۔ معاشرے کے عام کرداروں کو خاص کرنا چلہ طبقہ سے وہ اپنے افسانوں کو ہوا دیتے ہیں ان ہی کرداروں سے افسانے کی ہوا کا تانا بانا بنا جاتا ہے سرمایہ درانہ طبقے اور جاگیر دار طبقے کی رہن سہن پر طمانچہ رسید کیا ہے جن کی خلوت و جلوت میں۔

فرق روا ہوتا ہے اور یہ ہی فرق ان کو غریب طبقے سے روا رکھتا ہے، اس کتاب میں انہوں نے جس خاص باریکی اور خاص قرینے سے ناصر عباس نیر کو بطور "نثر نگار" کے متعارف کروایا ہے ناصر عباس نیر صاحب کی نثر پر باقاعدہ "چراغ آفریدم "2000 کو منظر عام پر آئی جو کاغذی پیراہن لاہور سے شائع ہوئہ جس میں کل چوبیس انشائیے تھے۔ان کے انشائیہ سے متعلق سکندر حیات میکن کہتے ہیں:

"ڈاکٹر ناصر عباس نیّر نے اپنے انشائیوں میں تازہ معنی کی تخلیق اور انفرادی راویوں کی دریافت کی ہے اور ان کو تخلیقی تقاضوں سے مزین کر کے پیش کیا ہے"

تنقید ایک فکر کا نام ہے جو بلا تفریق ادب کو پرکھتی ہے۔ ادب اور تنقید لازم وملزوم ہیں سکندر حیات میکن نے ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی جو فکر کا پہلو "جدید اور مابعد جدید تنقید ایک تحقیقی مطالعہ " کے نام سے متعارف کروایا وہ قارئین کے لیے نئی راہیں ہموار کرتی ہیں۔

وہ ناصر عباس نیر کے تنقیدی شعور اور تنقید شناسی کو سراہنے سے کجروی سے کام نہیں لیتے بلکہ کشادہ دلی سے ان کے فن کو تسلیم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ

"بحر تنقید کے شناور ڈاکٹر ناصر عباس نیر کثیر الجہت شخصیت ہیں مجید امجد اور وزیر آغا شناسی میں ناصر عباس نیّر نے بڑی بصیرت اور بصارت سے قلم اٹھایا ہے مجید امجد اور وزیر آغا ناصر عباس نیر کے مضامین استناد کا درجہ رکھتے ہیں"

لسانیات زبان کی ایک شاخ ہیں جس میں سائنسی اصولوں کے تحت زبان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ بعض قارئین لسانیات اور زبان کو ایک چیز قرار دیتے ہیں۔اس کتاب میں وہ ناصر عباس نیر کے "لسانیات اور تنقید" کے عنوان سے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا ذکر کرتے ہیں جو پہلی بار2009 میں منظر عام پر آئی۔ لسانیات اور زبان کے فرق کو سمجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں لسانیات اور زبان ایک ساتھ ہیں مگر ان کے فرائض مختلف ہیں۔

ڈاکٹر سکندر حیات میکن اس حوالے سے ناصر عباس نیّر سے متعلق لکھتے ہیں کہ

"انہوں نے زبان وادب کے امتیاز کے ساتھ ساتھ لسانیات اور تنقید میں ایک حد فاضل کھینچی ہے جس میں لسانیات اور تنقید کے الگ الگ مقاصد اور فرائض کی نشاندہی نہیں کی ہے۔"

ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے اس کتاب میں ان عنوانات کے تحت ناصر عباس نیر کی ادبی خدمات کو روشناس کروایا ہے جس سے ادب کے قاری کے لیے آسانی پیدا ہوئی ہے۔ معذور دماغوں کے لیے یہ مغز دوا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے مجید امجد کی شخصیت پر بھی قلم کشائی کی ہے۔ مجید امجد کی شخصیت کو محققین نے کبھی سنجیدہ نہیں لیا مگر محترم ڈاکٹر ناصر عباس نیر صاحب نے مجید امجد کی شخصیت کے گمشدہ پہلوؤں کو روشناس کروایا ہے۔ اور یہ اردو ادب پر دان ہے۔ ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے مجید شناسی کے حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر صاحب کے فن کو سراہا ہے۔ مجید امجد فطرت کے شاعر ہیں۔ فطرت کی خوشبو اور آب وہوا کو وہ اپنی نتھنوں سے محسوس کرتے ہیں اور یہ المیہ ہی کہ ایسے فطرت شناس شاعر کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ حس جمالیات کے شاعر کو ڈاکٹر ناصر عباس نیر صاحب نے جمال کے پیکر میں پیش کیا ہے کہ قارئین ان کی فطرت شناسی پر مبنی شاعری سے حظ محسوس کر سکیں۔ ڈاکٹر سکندر حیات میکن اس زمرے میں لکھتے ہیں کہ

"مجید امجد کے شعری میلان اور حقیقی بس یہ تو نے انہیں تخلیقی شعور عطا کیا ہے ناصر عباس نیّر نے مجید امجد کی مغائرت، تنہائی، اور دکھ کے تجربے کے ضمن میں مجید امجد کے انفرادیت کو پوری طرح واضح کیا ہے ناصر عباس نیّر نے مجید امجد کی نظموں میں قدیم اساطیری انسانوں اور دھرتی کی قوت نمو کے حوالے سے نئی معلومات کا انکشاف کیا ہے۔ انہوں نے مجید امجد کی سطحوں سے ایسے ایسے نکتے نکالے ہیں جو مجید امجد کی شعری تفہیم میں ایک انقلابی قدم کی حیثیت رکھتے ہیں"

ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے جو مضامین "عالمگیریت اور اردو اور دیگر مضامین" تخلیقی شعور کا بھی ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر صاحب کثیر الجہت شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ ان کی کتاب 2015 میں سنگ میل والوں نے شائع کی اس میں تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ جو مختلف نوعیت کے ہیں۔

ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے جس خاص باریک بینی اور محبت سے یہ کتاب تحریر کی یہ ان کی اپنے استاد اور نقاد ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی عقیدت میں لکھی گئی ہے جس میں مشاہدے کی آنکھ سے ایک شخصیت کو دیکھا اور ان کی شخصیت اور فن کو قارئین کے سامنے لے کر آئے۔

اس کے دوسرے حصے میں پانچ شخصیات کو اور ان کے فن کو ایک کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے تحقیق ہوتی وہی ہے جو مختصر مگر جامع ہو۔ بالکل سکندر حیات میکن نے کم لفظوں میں ادبی خزینے کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے ایک محقق کو یہ سہولت درکار ہوتی ہے اور جس چیز پر تحقیق کر رہا ہے اس کو جیسے چاہیئے تحقیق کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے ڈاکٹر اختر شمار کی شاعری اور ان کی تصانیف پر مفصل نوٹ لکھا ہے۔ اختر شمار کی شاعری میں صوفیانہ زندگی کا فلسفہ اور ہم آہنگی بتدریج پائی جاتی ہے اور یہ رنگ ایک قلبی واردات لیے ہوئے ہے۔

بنیادی طور پر انہوں نے "روشنی کے پھول سے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا اور پھر بھی اس سفر میں جو حسین موڑ آیا جس کے سحر کے گرفت میں قارئین آ گئے وہ موڑ تھا "عاجزانہ" جس نے سفر تکمیل سن 2018 میں کیا۔

ان کے اس شاعر کے کلام میں محبت اور امن کی خوشبو آتی ہے

"مت کسی کا گلہ کرو بھائی

سب پہ راضی رہا کرو بھائی

وہ جھگڑے رہیں بھلے تم سے

صلح کرتے رہا کرو بھائی"

اس نمونہ کلام میں امن و شانتی اور بھائی چارگی کی پرچار ملتی ہے ان کے ہاں تشبیہات و استعارات کا بھی بتدریج ذکر ملتا ہے جو شاید ادیب اپنی تخلیق میں استعارہ کا استعمال کثرت سے کرتا ہے وہ غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے ڈاکٹر اختر شمار کے شعری مجموعہ "عاجزانہ" کا اس کتاب میں ذکر کیا تاکہ ایک ادب کا قاری ان کی تخلیقی جہات سے واقف ہو جائے۔

جس میں حصے مزاح ہو وہ غیر معمولی اور تخلیقی دن کا مالک ہوتا ہے ہے اردو مزاح کو ہمارے اردو ادب میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ سنجیدہ ادب لکھنا زیادہ مشکل نہیں مگر مزاح لکھنا آسان بھی نہیں کیوں کہ اس میں مزاح کے ساتھ ایک اصلاحی پہلو اور کوئی نہ کوئی خرابی بیان کی جاتی ہے۔ مزاح میں یہ ہوتا ہے کہ انسان اتنا ہنسے کہ اس کی آنکھوں سے آنسوں اجائیں آنسو اس لیے نہیں بلکہ ان آنسوں میں معاشرتی ناہمواریوں پر ہمدردی کی بنا پر یہ آنکھوں سے آنسوں چھلک جائیں۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک طنز و مزاح اردو نثر میں خوب نام کمایا چکے ہیں ہیں ان کے مزاح میں شگفتگی اور اصلاحی پہلو غالب ہے۔ "نوعیت پر تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں کل 17 مضامین ہیں ان کے مضامین پر مبنی جو شاہکار ہے۔ ان میں "سر سید کے اسلوب میں طنز کے رنگ" شاعر فردا دوش جس میں "اقبال کی فکر و عظمت" کو موضوع بنایا گیا ہے. ڈاکٹر سکندر حیات نے ان کو مزاح کے ساتھ اقبال فہم کے طور پر بھی پیش کیا ہے۔ اس میں اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، مشتاق احمد یوسفی، اور خالد اختر پر مضامین لکھے گئے ہیں ڈاکٹر سکندر حیات اس زمرے میں کہتے ہیں۔

"ڈاکٹر اشفاق احمد ورک جب کسی فن پارے پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس کے باطن میں جھانکنا خود پر لازم کرتے ہیں"

پروفیسر غازی علم دین کی تازہ تصنیف "میثاقِ عمرانی" کو موضوع بنایا گیا ہے جو مفکرین کے تصورات فکر پر مبنی کتاب ہے جن کی فکر کو پیش کیا گیا ہے ان میں اور ابن خلدون، فارابی اور شاہ ولی اللہ وغیرہ شامل ہیں ڈاکٹر سکندر حیات میکن اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"غازی صاحب نے معاشرتی انتشار کا کھوج لگانے کے لیے مذکورہ تینوں مفکرین جو آپ نے اپنے عہد کے مشہور ماہر عمرانیات گردانے جاتے ہیں اس کی حکیمانہ فکر کا تجزیہ کیا ہے"

"مولانا غلام رسول مہر احوال و آثار" یہ ڈاکٹر محمد آصف اعوان کی تصنیف ہے. اس میں غلام رسول مہر کی شخصیت اور ان کے ادبی کارنامے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کتاب کے کل تین ابواب ہیں یہ المیہ ہے کہ غلام رسول مہر پر بہت کم کام کیا گیا ہے آصف عوان کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے اس ادبی شخصیت کو ادب کے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے ڈاکٹر سکندر حیات میکن رقم طراز ہیں کہ

"ڈاکٹر محمد آصف اعوان کی یہ کاوش نہ تو سندی تحقیق کی غرض پر مبنی ہے اور نہ ہی کسی تعارف کی تمنا کی متنی ہے"

جی شخصیات نے اردو ادب کے میدان کو وسعت دی ایک نہ مولانا شبلی نعمانی کا بھی ہے وہ کثیر الجہت شخصیت کے حامل تھے۔ڈاکٹر خالد ندیم نے ان کی آپ بیتی کو پہلی بار ترتیب دیا اور یہ ایسا ادبی کارنامہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کی زندگی کے ہر گوشے کو روشناس کروانے کی کوشش کی گئی ہے اس میں زمانی ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ڈاکٹر سکندر حیات میکن لکھتے ہیں کہ

"ڈاکٹر خالد ندیم کا یہ تحقیقی کارنامہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے"

"مطالعہ اسلوب کے تقاضے" ڈاکٹر منور مقبول عثمانی" کا تحقیقی مقالہ ہے اسلوب کسی بھی تخلیق کار کے لکھنے کا انداز ہوتا ہے اس ضمن میں بہت کم کتب لکھی گئی ہیں یہ تحقیقات گراں قدر اضافہ کا موجب ہے۔اس میں گیاں چند جین کی کتاب ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب" جبکہ علامہ عبداللہ یوسف علی کی تصنیف "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" اور اس کے علاوہ انور سدید کے نثری اسلوب کی اولین نمود" جیسے مقالات کو اس کتاب میں شامل کیا ہے۔منور عثمانی نے تین مقالات جو یکجا کیا ہے۔ ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے منور عثمانی کی اس کاوش کو سراہا ہے۔"یہ کتاب ناقدین اور محققین کے لیے راہ نما کا کام دے گی""اردو ادب کی تاریخی تنقید اور تجزیہ ایک تجزیہ"

ڈاکٹر اورنگزیب نیازی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہیں چکر آرہے نیازی کے ہاں تنقیدی شعور ادب کے بارے گہری وابستگی ان کی مسلسل مطالعہ کا نتیجہ ہے ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے اس حصے میں ڈاکٹر اورنگزیب نیازی صاحب کی علمی ادبی اور تفریحی سفر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ہے اس کی تحقیقی کاوشوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

"کڑوے رسیلے مضامین" جو 2005 میں مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،لاہوت سے شائع ہوئے۔یہ تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک دقیق کاوش ہے ڈاکٹر عالم زیب نیازی صاحب کی کتاب اردو ادب کی تاریخی تنقید و تجزیہ کیا اس کتاب کا کارنامہ یہ ہے کہ اس میں اہم ادبی تاریخوں کو سمویا گیا ہے۔

اور پھر دن مورخین کی ادب میں ایک ساتھ ہے ان کے نقطہ نظر کو بیان کیا گیا ہے۔ طالب علموں کے لیے یہ کتاب بہت سود مند ہے کیونکہ اس میں ادبی تاریخوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سکندر حیات میکن کہتے ہیں کہ

"حسن تہذیب، ترتیب، اور قرینے کے ساتھ مرتب کردہ یہ مضامین ادب شناسوں کے لیے بالعموم اور ادبی تاریخ کی پر رکھنے والوں کے لے بالخصوص بے حد مفید ثابت ہوں گے۔"

کراچی میں اردو غزل اور نظم، باکمال تصنیف:

شاہد کمال شاعر بھی ہیں۔ ان کے شعری مجموعہ منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پاکستان میں کراچی اردو ادب کا گہوارا رہا ہے اس مٹی میں بہت سے شعرا اور ادبا کا خمیر اٹھایا گیا ہے۔ شاہد کمال نے "کراچی میں اُردو غزل اور نظم" میں کراچی کے شعرا کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے اس کتاب کی ابواب بندی پر بات کی ہے اس کتاب کے کل تین ابواب ہیں۔ اس میں کراچی کی کوکھ سے جنم لینے والوں شعرا کی ادبی وقار کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر سکندر حیات میکن اس ضمن میں کہتے ہیں کہ

"شاہد کمال نے شراب کو جس تہذیب اور تہہ داری کے ساتھ پیش کیا ہے وہ بہت کم ناقدین کے حصے میں آتا ہے۔ مذکورہ تصنیف کراچی کے ادبی منظر نامے کے ساتھ ساتھ شاہد کمال کی تخلیقی، تنقیدی، اور ادبی کارناموں کا ایک نمایاں عکس ہے"

تعبیر حرف کی حرف شناسی

یہ مضامین و مقالات پر مشتمل ڈاکٹر غفور شاہ قاسم کی کتاب ہے جو 2014 میں شائع ہوئی چوک سکندر حیات میکن نہیں کی اس کتاب سے متعلق مفصل بیان کیا ہے اس کے کل دو حصے ہیں پہلا حصہ شاعری پر مبنی تنقیدی کتاب ہے۔ دوسرا حصہ نثر پر مشتمل ہے۔ جس میں یونس جاوید طارق اسماعیل ساگر، مستنصر حسین تارڑ پر تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر سکندر حیات میکن اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"تعبیر حرف میں ڈاکٹر غفور شاہ قاسم نے نشاط تعبیر میں بڑے نشاطیہ آہنگ میں تعبیر حرف کو مزید دو منازل کی طرح لے جانے کے خواب کی طرف واضح اشارہ کیا ہے"

بابو نگر سے دعوت شیراز تک،

حسین احمد شیرازی ایک مزاح نگار ہیں جن کی مزاح نگاری میں نفاست اور شائستگی پائی جاتی ہے صرف یہی نہیں وہ معاشرتی ناہمواریوں کو کریم کے سامنے لے کر آتے ہیں وہ سیاست پر بخوبی نظر رکھتے ہیں اور پھر ان پر ہلکے انداز سے تنگ بھی کرنے سے گریز نہیں کرتے. ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے حسین احمد شیرازی کی کتاب "دعوت شیراز "اور" بابو نگر" کو اس کتاب میں شامل کیا ہے۔

طنز و مزاح کا تعلق دلچسپ واقعات کی مدد سے معاشرتی مسائل کو بیان کرنے کا ہے بابو نگر بھی ان کی مزاح نگاری پر مبنی کتاب ہے۔ ان کا مزاحیہ ادب کا مشاہدے کی آنکھ کیے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر سکندر حیات میکن کہتے ہیں کہ

"حسین احمد شیرازی کا اسلوب دلکش اور جاذبیت سے لبریز ہے"

ان کے فن کو بہت سے جدید ہمعصر مزاح نگاروں نے سراہا بھی ہے جن میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان، عطاالحق قاسمی، ڈاکٹر رؤف پاریکھ اور ڈاکٹر اشفاق احمد ورک شامل ہیں۔

سنجیدہ ادب لکھنا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا مزاح لکھنا کیونکہ اس میں اصلاح کا پہلو ہوتا ہے پر مسکراہٹ بکھیرنا بھی اس کتاب میں ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے ڈاکٹر محمد کلیم مزاحیہ تصنیف "صاحب بہادر کی نگری میں" کو بھی متعارف کروایا ہے اس کتاب میں کل تیرہ مزاحیہ مضامین شامل ہیں۔ مزاح نگار کے برجستہ جملوں میں معاشرتی مسائل اور انسانی رویے بتدریج دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سکندر حیات میکن لکھتے ہیں کہ

"صاحب بہادر کی نگری" ایک سچے مزاح کے قلم کی پھلجھڑیاں ہیں جن میں تصنیع اور بناوٹ کا رنگ نظر نہیں آتا ہے"

تعبیر و تفہیم منفرد مجموعہ مضامین،

تعبیر و تفہیم "عبدالعزیز ملک کا تحقیقی کام ہے جنہوں نے مختلف مضامین کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔انہوں نے کشور ناہید پر "کشور ناہید کی تحریروں میں تانیثی رجحان" کے نام سے کام کیا ہے اس میں انہوں نے تنقیدی نظریات کو پیش کیا ہے انہوں نے سائنسی اور احساسی پہلوؤں پر بھی گفتگو کی ہے پیچیدہ اور مبہم تجربات کو پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔کشور ناہید کی شاعری اور تحریروں میں نسائی جذبات اور احساسات کی دلکش پیشکش کی گئی ہے اس کے علاوہ انہوں نے "آزادی سے قبل اردو ناول کے تناظر میں تانیثیت پسندی" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ پیش کیا ہے۔ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے افسانوی مجموعہ "صبح ہونے تک" جائزہ بھی پیش کیا ہے یہ تعبیر و تفہیم کی خوبی ہے کہ اس میں عبدالعزیز ملک کی محنت بتدریج دکھائی دیتی ہے۔

اس زمرے میں ڈاکٹر سکندر حیات میکن لکھتے ہیں کہ

"تعبیر و تفہیم سے واضح ہوتا ہے کہ عبدالعزیز ملک کا مطالعہ سطحی نہیں بلکہ گہرا ہے"

"اذن سفر دیا تھا" کیوں ایک سفر نامہ ایران

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کا سفر نامہ ابن سفر دیا تھا کیوں جو ایران کے حوالے سے ہے ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر چوک ہمارے بھی ہیں لہذا انہوں نے اس سفر نامے کو ایران کی تاریخ کے تناظر میں لکھا ہے۔ڈاکٹر سکندر حیات میکن لکھتے ہیں کہ

"ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کے اپنے سفر نامے میں ادبی اور تاریخی رنگوں کو باہم آمیخت کر دیا ہے اس سفر نامے میں ادبیت بھی چھلکتی ہے اور تاریخی آثار بھی اپنی آب و تاب کے ساتھ چمک رہے ہیں"

فضا اعظمی کے فلسفہ خوشی کا تجزیاتی مطالعہ (ایک تجزیہ)

محقق نئے گوشوں سے متعارف کرواتا ہے ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے کیسے ایک کتاب میں اتنے محققین کو سنانے کے لیے لیے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے نسیم انجم ادیب ہیں وہ افسانہ نگار اور ناول نگار بھی ہیں۔انہوں نے فضا اعظمی کی شاعری پر تحقیقی کام کیا ہے نسیم انجم نے فضا اعظمی کی دو شعری مجموعہ "خوشی کی تلاش""خوشی کے نام کا سکہ "کا تحقیقی مقالہ پیش کیا جس کا نام "فضا اعظمی کے فلسفہ خوشی تجزیاتی مطالعہ" ہے۔

ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے نسیم انجم کی اس کاوش کو سراہا ہے اور اس سے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ

"نسیم انجم نے اپنی تصنیف فضا اعظمی کے فلسفہ خوشی کا تجزیاتی مطالعہ "میں فضا اعظمی کی سوچ اور فکر کے دھاروں کی جو توسیع کی ہے وہ نہایت عمدہ ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ نسیم انجم نے اس تخلیقی خوشی کی روح کو پالیا ہے"

ڈاکٹر سکندر حیات میکن کی تنقیدی بصیرت ان کے وسیع مطالعہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ جن موضوعات کو موضوع تحقیق بناتے وہ شاز و نادر ہی کوئی محقق محسوس کرے وہ ادب کو مختلف زاویے سے دیکھتے ہیں خاص کر عصر حاضر کی علمی و ادبی شخصیات اور موضوعات پر ان کی گہری نظر ہے اس کتاب میں جامع اور مختصر انداز میں تحقیق کی گئی ہے۔

حکیم محمد صادق سیالکوٹیؒ کی اردو سیرت "جمالِ مصطفی ﷺ" کا تعارف و جائزہ

ڈاکٹر محمد انصر جاوید گھمن

اردو سیرت کی کتاب "جمالِ مصطفی ﷺ" مولانا حکیم محمد صادق سیالکوٹی رحمہ اللہ کی ایک مشہور تصنیف ہے۔ یہ کتاب نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار، لاہور سے چھپی ہے۔ اس کتاب کا سرورق بہت زیادہ خوبصورتی سے مزین کیا گیا ہے، جس کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے ارشادِ پاک "اور ہم نے آپ ﷺ کو سب جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔" کے ساتھ درج ذیل شعر سے کی گئی ہے:

سیلاب رنگ و نور طلوع سحر میں ہے تابندہ کہکشاں تیرگر سفر میں ہے

حکیم صاحب اپنی کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کرواتے ہیں:

"اس کتاب میں آرام جاں، سکون ایمان، کاشفِ سر کن فکان، دلدارِ مسکان، غم خوارِ عاصیاں، ممدوحِ قُدسیاں، سرخیلِ نوریاں، رحمتِ عالمیاں، سید الکونین، سید الثقلین، حبیبِ خدا، اشرف الانبیاء، شافعِ روزِ جزاء، حضرت محمد مصطفی ﷺ کا حسن صحیح معنوں میں اپنی رعنائیوں کے ساتھ جلوہ بار ہے۔"

مولانا حکیم محمد صادق سیالکوٹی رحمہ اللہ نے حسنِ صورت بھی بیان کیا ہے اور حسنِ سیرت بھی بیان کیا ہے۔ حکیم صاحب نے مندرجہ بالا القابات جو بیان کیے ہیں درحقیقت یہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے مختلف پہلو ہیں جو حکیم صاحب نے بڑے حکیمانہ انداز میں بیان فرمائے ہیں۔ پھر حکیم صاحب نبی ﷺ کی سیرت کو اشعار کی صورت میں بیان کرتے ہیں اور آفتابِ نبوت میں آفتابِ کردار کو نمایاں کرتے ہیں۔ جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں

وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

کہکشاں ہے تیرے اہرار مقدس کا غبار

تیرے نقش پا ہیں فردوس بریں کے لالہ زار

حکیم صاحب بڑے باذوق آدمی ہیں۔ وہ شعر و شاعری کو بھی رسول اللہe کی سیرت کے لیے استعمال کرتے ہیں اور حکیم صاحب عربی ادب کے بھی شائق نظر آتے ہیں بلکہ آپ عربی زبان کے بھی ماہر تھے اور اپنی کتابوں میں حضرت امام بوصیری رحمہ اللہ کی شاعری کو بہت زیادہ جگہ پر سجایا ہے جیسا کہ آپ نے مندرجہ ذیل اشعار بھی لکھے:

"اور وہ ذاتِ مبارک آیتِ کبریٰ ہے عبرت کرنے والے کے واسطے اور وہی ہے نعمتِ عظمیٰ غنیمت گننے والے کو۔"

"آپ نے سیر فرمائی ایک شب میں حرمِ مکہ سے حرمِ بیت المقدس تک۔ جیسے چودھویں رات کا چاند چلے اندھیری رات میں۔"

"اور ترقی کرتے گئے یہاں تک کہ پہنچے قاب قوسین کے رتبہ کو جو نہ ادراک کیا جاسکتا ہے اور نہ طلب کیا جاسکتا ہے۔"

ان اشعار میں حکیم صاحب نے رسول اللہ ﷺ کی عظمت و رفعت اور مقام و مرتبہ بذریعہ معراج بیان کیا ہے اور بتلایا ہے کہ حقیقت میں آپ کی سیرتِ طیبہ کا ہی نتیجہ ہے کہ اللہ نے آپ کو معجزات سے نوازا ہے اور آدمی تو قاب قوسین تک نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ کوئی نبی اور رسول بھی اس مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ ان کی سیرت کا مرتبہ اور کردار و گفتار کا مقام اتنا نہیں ہے جتنا کہ سید الکونین ﷺ کی سیرت کا مقام و مرتبہ ہے۔ آپ اس کتاب کے تعارف کے بعد دیکھیں کہ حکیم صاحب نے اس کتاب میں آپ کی سیرت کو حسن و جمال اور آپ ﷺ کے تخلیقی پہلو کو مد نظر رکھ کر مطالعہ کیا ہے۔ بعد ازاں فہرست کو لاتے ہیں۔

خطبہ رحمت اللعالمین تحریر کرنے کے بعد اس کا ترجمہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ نبی کریم ﷺ کا وہ جامع خطبہ ہے جو حضورe اپنے ہر وعظ اور تقریر کے شروع میں پڑھا کرتے تھے۔ جو حدیث کی کتب مسلم، ابوداود، ترمذی وغیرہ میں موجود ہے۔"

جمالِ مصطفی ﷺ سے کیا مراد ہے؟ حضرت العلام حکیم محمد صادق سیالکوٹی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہے ان ہی رسول رب العالمین، رحمت اللعالمین ﷺ کی صفتوں، بزرگیوں، وصفوں، خوبیوں، نعمتوں، فضیلتوں، مقاموں، شانوں، اور وصفوں کا چمن زار ہے جس کے گلہائے رنگارنگ کی مہک مشام جان کو معطر کرتی اور ایمان کو تازگی بخشتی ہے۔ حکیم صاحب نے اردو ادب نثر اور اشعار میں پیش کیا ہے۔ صفحہ نمبر 21 تا 34 میں حکیم صاحب اس میں بھی ادبی اسلوب کو اپناتے ہوئے درود وسلام بھیجتے ہیں۔ اللہ اس نیر بطحاء، انجم طہ، ماہِ دنی، مہرِ تدلّٰی، زینتِ کعبہ، رونقِ منبر، گوہرِ وحدت، آیۂ رحمت، کانِ فتوت، بحرِ نبوت، جانِ دو عالم، شافعِ محشر پر کروڑوں، نیلوں، پدموں، سنکھوں کی تعداد بھر ادرود وسلام نازل فرما:

اس کتاب جمال مصطفی میں مولانا حکیم محمد صادق سیالکوٹی رحمہ اللہ نے نبی کریم ﷺ کی سیرت کا آغاز تاریخی انداز میں آپ کی ولادت باسعادت سے شروع کیا ہے، بلکہ پوری دنیا کی تخلیق سے پہلے کے واقعات کو بھی تحریر فرمایا ہے۔ ابھی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا ہی تھا تو ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا تو پوری انسانیت کی تخلیق کی تو ان سے اپنی ربوبیت کا وعدہ لیا۔ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں" تو ہی ہمارا رب ہے۔ پھر دوسرا وعدہ صرف ان حضرات سے لیا جن کے سروں پر نبوت ورسالت کے تاج سجا دیے گئے تھے، یعنی آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء علیہم السلام سے عہد واقرار لیا کہ جب کبھی ان میں سے کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب وحکمت دے کر دنیا میں لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا جائے اور اس کی زندگی میں رسول (حضرت محمد ﷺ) آئیں تو ان پر ایمان لانا اور ان کی دین میں مدد کرنا ان کا فرض ہو گا۔ سب نبیوں سے یہ اقرار اور وعدہ لے کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "کیا تم اقرار کرتے ہو؟ سب نے کہا: ہاں! ہم اقرار کرتے ہیں۔" پھر فرمایا: "گواہ رہو اور میں بھی اس اقرار کرنے پر گواہ ہوں۔ سنو! اب اس عہد اور میثاق سے جو پھرا وہ فاسق ہے اور اطاعت سے باہر آنے والا ہے۔"

سیرت النبی ﷺ کی خصوصیات تاریخی انداز میں۔ نبی کریم ﷺ کی عمر کے ابتدائی سال دیہاتی زندگی میں بسر ہوئے تھے۔ اس لیے سادگی وبے تکلفی نے حضور ﷺ کے ساتھ نشوونما پائی تھی۔ لڑکپن کا زمانہ ایسے وقت میں کٹا تھا جب کہ قوم حرب الفجار وغیرہ لڑائیوں میں مصروف تھی۔ اس لیے امنِ بسیط اور ہمدردیِ عامہ کی قدر ومنزلت شروع ہی سے حضور ﷺ کے خاطر نشین

تھی۔ 25 سال کی عمر تک حضور ﷺ نے شادی نہیں کی۔ تجرد کا یہ زمانہ جو عین عنوانِ شباب کا عالم تھا، کمال عفت، عصمت، شرم وحیا، سے سفر ہوا۔ دیکھنے والوں کی شہادت موجود ہے کہ حضورe ہر پردہ نشین کنواری لڑکیوں سے بڑھ کر شرم والے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے معاش کے لیے تجارت کو پسند فرمایا تھا اور اس طرح ان بلند حوصلہ لوگوں کے لیے جو ثبات واستقلال معاملہ فہمی اور ضرورت شناسی، حلم وبردباری سے متصف ہوں، ہدایت فرمائی کہ تجارت سے بہتر اور کوئی معاش نہیں۔ مردانہ جمال میں کمال حسین، حسب ونسب میں عالی خاندانی ہونے پر بھی ایک بیوہ عورت سے جو عمر میں حضور ﷺ سے پندرہ برس بڑی تھی، پہلا نکاح کیا اور اس سے عقد کی ضرورت وعظمت پر نہایت شاندار نمونہ قائم فرمایا۔ یہ بیوی نہایت متمول تھی، لیکن آنحضرتe نے اپنی قانعانہ قابلیت اور زاہدانہ سیرت کی وجہ سے اپنے آپ کو اپنی بیوی یا اپنے خاندان کی مالی امداد سے ہمیشہ مستغنی ثابت کیا اور اس طرح اپنی مدد آپ کرنے والوں کو سرِ راہ ایک مشعل روشن فرمائی۔ آنحضرتe نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی صادقانہ وہمدردانہ زندگی کا اثر خونخوار عرب میں پھیلا دیا تھا۔ اور سب کے دلوں میں اپنے لیے عزت ومحبت کے ساتھ جگہ بنالی تھی اور اس طرح لوگوں کے لیے ایک درخشندہ مثال قائم فرمادی کہ کیوں کر نیکی اور صداقت کی طاقت ظلم اور جہالت کو مغلوب کر سکتی ہے۔

مولانا حکیم محمد صادق سیالکوٹی رحمہ اللہ نے نبی کریم ﷺ کی سیرت کی خصوصیات کے لحاظ سے تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ جس میں دیگر انبیاء کے ساتھ ان کی سیرت کو سامنے رکھ کر نبی کریم ﷺ کی سیرت کو اجاگر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچانے میں جس طرح پہلے انبیاء کو مشکلات پیش آئیں تو ان کا تقابل آپ کی مشکلات اور پریشانیوں سے کیا جائے تو وہ کئی گناہ زیادہ ہیں، لیکن جب ان کے مدِ مقابل صبر واستقامت سے ان مصائب کا مقابلہ کیا جائے تو جس طرح سے پہلے انبیاء اور رسل نے ہجرتیں کیں تو آپ ﷺ نے ان سے بڑھ کر اپنے اصحاب واہلِ بیت کے ساتھ ہجرتیں فرمائیں اور آپ نے ایسی سیرت کے نقوش چھوڑے اور بے مثال کردار ادا کیا کہ دیگر انبیائے کرام علیہم السلام نے تو بعض دفعہ دل برداشتہ ہو کر بددعائیں بھی کیں اور عذابِ الٰہی کی دعائیں کیں اور ان قوموں پر عذاب نازل ہوئے، لیکن آپ ﷺ نے سخت مصائب اور تکالیف دیے جانے پر ارشاد فرمایا:

"اے اللہ! میری قوم کو بخش دے، پس بے شک وہ نہیں جانتے۔"

آپ ﷺ نے فرمایا:

''جاؤ تم آزاد ہو آج تم کو کوئی پکڑ نہیں ہے۔''

اس معاملے میں آپ کی سیرت دیگر انبیاء علیہم السلام سے نمایاں نظر آتی ہے۔ حکیم صاحب نے بڑے خوبصورت انداز میں تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ بعد ازاں رحمۃ للعالمین کے فضائل کا عنوان باندھ کر تفصیلاً آپ ﷺ کی فضیلت کو بیان کیا۔ آپ e کا حلیہ مبارک اور سرور کائنات کے گزر اوقات، لباس، کھانے، پینے، سونے، رونے وغیرہ کا یہاں تک کے آپ کے جنازے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کا مکمل جائزہ لیا جائے تو مندرجہ ذیل سیرت کے پہلو نمایاں نظر آئیں گے۔ آپ کے اخلاق واقدار، چلنے پھرنے، رہنے سہنے و دیگر اندازِ زندگی۔

اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ حکیم صاحب نے اس کی تحریر عام فہم اور سادہ رکھی ہے اور اس کو موجودہ حالات وواقعات کو مدِ نظر رکھ کر تحریر کیا ہے اور اس بات کو واضح کیا ہے کہ جس کی عظمت اور شان کا یہ عالم ہو کہ آپ ﷺ تمام نبیوں کے امام ہوں اور قاب قوسین او ادنیٰ کا مقام حاصل ہو تو پھر اس ہستی کی اطاعت اور فرمابرداری خود بخود ہی کر کے انسان فخر محسوس کرتا ہے اور صحابہ کرام y کی ایسی مثالیں بہت زیادہ ملتی ہیں اس لیے حکیم صاحب نے اس کتاب میں زندگی کے تمام پہلوئوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

حکیم صاحب نے آپ ﷺ کی عظمت اور شان کو بیان کرنے کی بڑی کوشش کی ہے، لیکن اس کے باوجود کئی فضیلت کے پہلورہ گئے ہیں جن پر گفتگو کرنا ضروری تھی۔ مثلاً آپ کی عظمت غیر مسلموں کی نگاہ میں کیسی ہے؟ اپنے تو شان بیان کرتے ہی ہیں، لیکن اگر کوئی کرے تو ''اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَائُ'' کا مصداق ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ حوالہ جات کی کمی ہے اور کسی حوالہ کی تخریج نہیں کی گئی اور نہ ہی کتاب کے مصادر و مراجع لکھے گئے جو اہلِ علم کے نزدیک انتہائی ضروری ہے اور کتاب ھٰذا میں بعض مقامات میں موضوع سے ہٹ کر گفتگو کی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب کا حجم تو بڑھ گیا ہے، لیکن گفتگو با مقصد نہیں ہوئی اور ان عنوانات کو بلا ترتیب رکھ دیا گیا ہے۔ جس سے کتاب کی جامعیت کی کمی محسوس ہوتی ہے اور کئی جگہوں میں مشکل الفاظ کو بیان کیا گیا ہے اور وضاحت ضروری ہونے کے باوجود نہیں کی گئی اور کتاب میں اشعار کی تشریح نہیں کی گئی اور نہ ہی مکمل حوالہ دیا گیا جس کی وجہ سے اشعار کا مفہوم سمجھنے میں عام آدمی قاصر ہے۔ بہر کیف ان کمزوریوں کو دور کر دیا جائے تو کتاب اپنے موضوع پر بے مثل ہے۔

افسانچے

آن لائن لیکچر

شاہد اشرف

گزشتہ ایک برس کے دوران میں کووڈ کی وجہ سے آن لائن لیکچر دیتے ہوئے وہ کئی تجربات سے گزرا۔ پہلے پہل وہ اپنے دھیان میں لیکچر دیتا رہا۔ کچھ دنوں بعد اسے کیمرہ آف ہونے کے باوجود سٹوڈنٹس کی موجودگی اور عدم موجودگی کا اندازہ ہونے لگا۔ کبھی کبھی وہ کسی طالب علم کی موجودگی کی تصدیق کے لیے سوال بھی پوچھ لیتا تھا اور اس کا اندازہ درست نکلتا تھا۔ آہستہ آہستہ اسے مکمل ادراک ہونے لگا کہ کیمرہ آف ہونے کے باوجود کون سٹوڈنٹ موجود ہے اور کون لنک جوائن کرنے کے بعد سو گیا ہے۔ ذہنی رابطہ برقی رابطے سے زیادہ موثر محسوس ہونے لگا۔ وہ کیمرہ آف ہونے کے باوجود دیکھنے پر قادر ہو گیا۔ کسی سٹوڈنٹ کا تصور کرتے ہی اس چہرے پر ہویدا اداسی، بیزاری، انہماک، دلچسپی اور نیم دلی سمیت دیگر کیفیات کا انکشاف ہونے لگتا تھا۔ وہ صرف غور سے آئی ڈی کی طرف دیکھتا اور سٹوڈنٹ کی ذہنی کیفیت ظاہر ہو جاتی۔ وہ مخاطب ہوئے بغیر کسی سٹوڈنٹ کی کیفیت پر رائے دیتا اور پھر متعلقہ سٹوڈنٹ کی حیرت کو انجوائے کرتا تھا۔ وہ دوران تدریس بہت سے تجربات سے گزرا۔ اس کے دل میں ایک خیال زور پکڑنے لگا۔ اس نے خیال کو جھٹکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اسی خیال کے زیرِ اثر ایک دن اس نے تمام سٹوڈنٹس کو کیمرے آن کرنے کا کہا۔ سٹوڈنٹس اپنے اپنے کیمرے آن کر بیٹھ گئے۔ وہ سب کو دیکھ سکتا تھا مگر اسی لمحے اسے شدید دھچکا لگا۔ وہ کسی بھی سٹوڈنٹ کی کیفیت کو پڑھنے سے قاصر تھا۔

ڈیجیٹل بچے

محمد علی صدیقی

"انٹرنیٹ اور موبائیل نے نوجوان نسل کو کہاں پہنچادیا ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ آنے والا کل نہ جانے کیسا ہو۔!!۔" مینیجنگ کمیٹی کے صدر نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"اتنی مایوسی ٹھیک نہی" میں نے کہا۔

میں کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ ایک ٹیچر درجہ چہارم کی ایک بچی کو لے کر آفس میں داخل ہوئیں اور بولیں

"سر یہ آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔"

"ہاں۔ کہو" میں نے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"سر۔۔۔ کلاس میں ایک لڑکا مجھے بھابھی بلاتا ہے۔"

وہ اپنی مسکراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ میں نے اس بچے کو بلا کر وارننگ دی اور ٹیچر سے کہا

"آپ لوگ یہ شکایتیں خود ہی سن لیا کریں۔ آفس میں نہ لایا کریں۔"

"ہم تو سنتے ہی رہتے ہیں سر۔ میں نے سوچا کہ آج آپ بھی سن لیں" ٹیچر نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا، "کل کے۔ جی کا ایک بچہ اپنے ساتھ بیٹھی بچی سے پوچھ رہا تھا کہ کیا وہ اس سے پیار کرتی ہے۔ بچی کی شکایت پر میں نے ان دونوں کو الگ الگ بٹھادیا لیکن کچھ ہی دیر بعد دونوں پھر ایک ساتھ بیٹھے باتیں کرتے نظر آئے۔"

میں نے ٹیچر کو جانے کا اشارہ کیا اور صدر کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

طبقاتی نظام میں ہوا کی تقسیم

محمد جمیل اختر

درخت کم تھے، آبادی زیادہ اور ہوا اِس قدر آلودہ تھی کہ لوگ سانس لینے کی خاطر آکسیجن سلینڈر اپنے ساتھ رکھتے۔۔۔ جگہ جگہ آکسیجن اسٹیشن بن گئے تھے جہاں لوگ لمبی قطاروں میں اپنی اپنی باری کا انتظار کرتے رہتے۔۔۔ بڑی بڑی کمپنیاں دن رات اپنے اشتہارات تقسیم کرتی رہتیں کہ اگر اپنے پھیپھڑوں کو تندرست وتوانا رکھنا چاہتے ہیں تو اُن کی کمپنی کا آکسیجن سلینڈر حاصل کریں، اگرچہ فضا میں آکسیجن اب بھی موجود تھی لیکن اِن کمپنیوں نے جدید تحقیق سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اب بغیر آکسیجن ماسک کے سانس لینا زندگی کے لیے خطرہ ہے سو لوگ سانس لیتے ہوئے گھبرانے لگے۔

آکسیجن کی تقسیم میں بھی طبقاتی نظام رائج تھا، طاقتور کو زیادہ اور آسانی سے آکسیجن دستیاب تھی بلکہ اُنہیں کبھی بھی آکسیجن حاصل کرنے کی خاطر قطار میں نہ کھڑا ہونا پڑتا اور ابھی اُن کے گھروں کے سٹور روم میں کئی سلینڈر پڑے ہوتے کہ نئی کھیپ اُن کے دروازے پر پہنچ جاتی یہی وجہ تھی کہ اُن لوگوں نے کئی کئی سالوں کی ایڈوانس آکسیجن جمع کر رکھی تھی۔۔۔ غریب لوگ اپنے پرانے سلینڈر ہاتھوں میں لیے قطار میں کھڑے رہتے، بہت سے لوگ دم گھٹنے کی وجہ جان کی بازی ہار جاتے۔۔ اُن کے عزیز رشتہ دار سڑک بند کر کے احتجاج کرتے لیکن طاقتور طبقہ ہمیشہ یہی کہتا کہ ہمیں تمہارے دکھوں کا پوری طرح احساس ہے، جلد کوئی حل نکالتے ہیں، سڑک کھول دو۔۔۔ سڑک کھل جاتی لیکن حل نہ نکلتا حتیٰ کہ کوئی اور آدمی دم گھٹنے سے ہلاک ہو جاتا۔۔۔۔

تیراک

وجیہہ ضمیر

پورا دن گزر گیا اور شام ہونے والی ہے۔ دریائی پانی کے بہاو پر شفق کے عکس کی چادر تن گئی ہے۔ بوڑھا ماہی گیر، جس کے ماتھے کی شکنیں مزید گہری اور ایک دوسرے کو کاٹنے لگ گئیں۔ وہ تھکن کے احساس سے بڑبڑانے لگا۔ "آج کا دن ہی کچھ منحوس تھا۔ کوئی بڑی مچھلی ہاتھ نہ آئی"۔ بوڑھے ماہی گیر کا معاون، اٹھارہ برس کا کھلنڈرا جوان ہے۔ جسے اس کی بوڑھی بیوہ ماں نے، مچھلیاں پکڑنے کے گر سیکھنے کے لیے اس کے پاس چھوڑ رکھا تھا۔ یہ انتہائی جذباتی، متجسس اور ہر وقت اپنی ذات کے اندر بے تکے سوالوں کی ٹرٹر لگائے رکھتا تھا۔ وہ ہر لمحہ کچھ نہ کچھ سوچتا ہی رہتا، خود ہی سوال اٹھاتا اور خود کو ہی جواب دے کر مطمن کر دیتا۔ لیکن پچھلے کچھ عرصے سے خدا کا منطقہ اس کے ذہن میں یوں اٹک گیا جیسے گلے میں ہڈی پھنس جاتی ہے۔ سارا دن یہ سوال مسلسل پوچھ پوچھ کر اس نے اپنے استاد کا سر کھا لیا۔ استاد اسے بے وقوف لڑکا سمجھتے ہوئے کئی طرح سے ٹالتا رہا۔ لڑکے نے آخری بار پوچھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ذرا تیکھے پن سے کہا:

"استاد! اب بتاو ہی دو، یہ خدا کس بلا کا نام ہے؟"

استاد نے جال سمیٹے اور تیوری چڑھاتے ہوئے، اسے دیکھا اور بولا۔ "بکو مت، یہ کیا بکواس کر رہے ہو سنو۔ خدا نظر نہیں آتا، لیکن رحم و کرم سے بھرپور اور انسان سے محبت کرتا ہے۔" لڑکے کے ذہن میں اٹکا یہ معاملہ جیسے سلجھ گیا ہو۔ وہ پہلے زیر لب مسکرایا، پھر ہنسا، پھر قہقہے لگانے شروع کر دیے اور رواں گہرے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ شاید اس نے یہ سوچا ہو گا کہ مجھے بھی نظر نہیں آ اچھا تو سنو! خدا بہت مہربان ہے، استاد نے بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا اس کے علاوہ؟ لڑکے نے مزید پوچھا اس کے علاوہ خدا انسانوں کی مدد کرتا ہے ظالم انسانوں کی طرح ظلم نہیں کرتا، بیوہ اور لاچار عورتوں کی دادرسی کرتا ہے اس کے علاوہ اس کو موت نہیں ہے وہ امر ہے امر۔۔۔ استاد نے علمیت جھاڑتے ہوئی کہا لڑکے نے ہاتھ سے کنکریاں دریا میں پھینکنا بند کر دیں اور وادیوں میں چیخ کر بولا "اے پربت کے پہاڑوں، اے افق کی آغوش میں سونے والے سورج اور تھر تھرا دینے والی ہوا گواہ رہنا میں خدا ہوں، میں خدا ہوں، اور اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی.

افسانے

چوتھا دروازہ

خالد فتح محمد

اُس کی اُداسی، پریشانی، لاتعلقی اور غمی بالکل اُسی طرح تھی جیسے پہلے شوہر کی موت سے چند دِن پہلے تھا جو کچھ ہو جانے کی دلیل تھی یا نایافتنی کا احساس۔ یہ خیال آتے ہی وہ پریشان ہو گئی۔ وہ اگر پہلے شوہر سے خوش نہیں تھی تو دوسرے کے ساتھ ایسا قریبی تعلق نہیں تھا کہ اُسے اُس کے مر جانے کا دکھ ہو: دکھ تو کسی بھی موت کا ہوا کرتا ہے۔ یہ آدمی اُس کی مادی زندگی کی ضروریات پوری کرتا رہا تھا اور اُس میں کوئی ایسی خرابی بھی نہیں تھی لیکن وہ اُس کے ساتھ خود کو جوڑ نہ سکی۔ وہ ذہنی طور پر اُس سے اُتنا ہی دور رہی جتنا پہلے خاوند سے تھی۔ پہلے خاوند سے شادی اگر اتفاق نہیں تھا تو اُسے منصوبہ کہنا بھی مناسب نہیں، اُسے جو آدمی پسند تھا اُس کے ساتھ شادی ممکن نہیں تھی کیوں کہ وہ آدمی اچھی شہرت نہیں رکھتا تھا۔ اُسے شراب کی عادت تھی، ہر وقت نشے میں ہوتا اور جب کبھی اُسے دیکھتا، احترام میں نظر نیچے کر کے ایک طرف ہٹ کے کھڑا ہو جاتا۔ وہ اُس کے پاس سے گزر جانے تک وہیں کھڑا رہتا۔ شروع میں اُسے اُس کا ایک طرف ہٹ کے کھڑے ہونا نشے کا حصہ لگا لیکن جب یہ ہمیشہ ہی ہونے لگا تو اُسے احساس ہوا کہ وہ ایسا اُس کے لیے کرتا ہے اور وہ اُسے ایسی نظر سے دیکھنے لگی جس سے ارد گرد کے باقی لوگ نہیں دیکھتے تھے: وہ اب پاس سے گزرتے ہوئے ہمیشہ مسکرا دیتی۔ یہ مسکراہٹ بالکل واضح نہیں تھی، ہونٹوں کی ہلکی سی جنبش، آنکھوں میں ہلکی سی روشنی کا سایہ، گالوں پر ہلکی سی سرخی کا کھنڈ جانا اور چال کا ہلکے سے شتابی ہو جانا۔ جب یہ سب ہو رہا ہوتا اور وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ ہو رہا ہے، وہ آدمی اِ س تبدیلی دیکھ رہا ہوتا اور اُس کی اُسے دیکھنے کی خوشی اُداسی میں تبدیل ہو جاتی۔ اُسے شک تھا کہ وہ زیادہ دیر جیے گا نہیں اور کسی خوب صورت عورت کا اُسے دیکھ کے دوبارہ دیکھنے کی خواہش میں اتنا خوش ہو جانا اچھا تو لگتا تھا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اُسے پسند کرے، سوائے اُن چند لوگوں کے جو اُسے پیدائش سے جانتے ہونے کے باوجود ایک طرح سے بیگانگی کا شکار تھے۔

وہ جب اپنے گھر سے نکلتی تو وہاں کھڑا ہوتا جہاں سے اُس نے گزرنا تھا اور اپنے ساتھ یہی عہد کر کے آتا کہ آخری بار وہاں کھڑا ہونے آیا ہے۔ اُسے اُس کی واپسی کے وقت کا بھی پتا تھا اور پرانے عہد کو نہ توڑتے ہوئے نئے کے ساتھ وہاں پھر آن موجود ہوتا۔ اگر کسی دِن نہ آ سکتا، وہ اُس کے نہ آنے کی وجہ تو نہیں جانتی تھی اور نہ ہی وہ بتا سکتا تھا کہ وہ شدید دردِ سر میں مبتلا ہے۔ اُسے مایوسی ضرور ہوتی اور وہ سوچتی: شبیر اگر آ ہی جاتا تو کچھ حرج بھی نہیں تھا۔ شبیر کو وہاں نہ آنا مزید سر درد کا سبب بنتا اور وہ سوچتا: رابعہ کیا سوچتی ہو گی؟ رابعہ کپڑے سینے کی ایک فیکٹری میں کام کرتی تھی جہاں اُس کا مردوں کے ساتھ واسطہ رہتا اور اُس کے اندر مرد کا خوف ایک وبا کی طرح بھرا ہوا تھا۔ وہ جب تنخواہ لینے کے لیے قطار میں لگتی اور اُسے پیسے تھمانے والے بوڑھے کلرک کا غلطی سے

ہاتھ چھو جاتا تو رابعہ کو ہمیشہ ایک کراہت کا احساس ہوتا۔ اُسے محسوس ہوتا کہ وہ پلید پیسے لے رہی ہے گو وہ کلرک اُس کے باپ سے عمر میں زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ اب کلرک ہر مہینے تنخواہ دیتے وقت رابعہ کے ہاتھ کو چھوتا اور کبھی کبھار تھام بھی لیتا، جیسے ہتھیلی پر نوٹ رکھتے ہوئے اتفاقاً تھاما گیا ہو۔ رابعہ کی شروع کی کراہت اب لاتعلقی میں تبدیل ہو گئی؛ یہ ایک معمول بن گیا تھا۔ رابعہ اور شبیر کے درمیان میں کبھی کوئی بات تو نہیں ہوئی تھی لیکن دونوں کو ایسے محسوس ہوتا کہ وہ پہروں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے رہتے ہیں۔ وہ شادی کرنا چاہتے تھے، رابعہ غریب تھی لیکن خوب صورت اور شبیر پیسے والا تھا لیکن شرابی؛ ہر کوئی جانتا تھا کہ شرابی کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا اور مستقبل والا شرابی نہیں ہوتا چناں چہ یہ رشتہ کبھی زیر غور نہیں آیا، جب کہ بوڑھا کلرک اپنی چیک بک اور بنک سٹیٹ مینٹ کے ساتھ رابعہ کے گھر پہنچ گیا۔ داماد کی عمر کا معاملہ اُس کی بنک سٹیٹ مینٹ نے حل کر دیا؛ مرد اور گھوڑا کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ رابعہ کی بوڑھے کلرک عباس کے ساتھ شادی ہو گئی۔ اِس شادی میں رابعہ کی ایک ہی شرط تھی کہ وہ کارخانے میں کام کرنا بند نہیں کرے گی، وہ شبیر کو ہر روز دیکھنا چاہتی تھی لیکن شبیر اُسے کبھی نظر نہیں آیا۔ وہ اُس کے متعلق کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتی تھی کہ اُس کی رہائش کہاں تھی؟ وہ صرف اُس کا نام جانتی تھی کیوں کہ وہ شبیر شرابی مشہور تھا۔ اُس نے شبیر کو دوبارہ دیکھا تو نہیں لیکن دوبارہ دیکھنے کی اُمید پر کارخانے میں کام کرتی رہی۔

بوڑھا کلرک عباس رنڈوا تھا اور اُس کی جوان اولاد اپنی اپنی زندگی جی رہے تھے۔ رابعہ کے آنے سے عباس کلرک کو پہلی مرتبہ اپنا گھر رہنے کے قابل لگا؛ پہلی بیوی گھر کو ایک سرائے ہی سمجھتی رہی تھی، گو اُس کے بچے تو پیدا ہوئے لیکن اُس نے کلرک عباس کو کبھی بطور خاوند قبول نہیں کیا تھا۔ رابعہ کو کلرک عباس بھا تو نہیں سکتا تھا لیکن ساتھ رہتے ہوئے اُسے بوڑھے کے ساتھ ہمدردی ضرور ہو گئی تھی۔ بوڑھا کلرک اُس کی خواہشات کے علاوہ ہر ضرورت کا خیال رکھتا، وہ مطمئن ہوتے ہوئے بھی غیر مطمئن تھی، وہ بغاوت کرنا چاہتی تھی لیکن اُسے بغاوت کے انجام سے بھی خوف آتا تھا۔ وہ انجام سے نمٹنے کو تیار تو تھی لیکن اُس میں بغاوت کے آغاز کرنے کا حوصلہ نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ اپنی ضروریات کے پورا ہونے پر ہی اکتفا کیے رہی۔

پھر وہ اُداس رہنے لگی۔ اُداسی شروع ہونے سے پہلے بھی وہ اُداس ہی رہتی تھی لیکن اِس اُداسی کی نوعیت مختلف تھی؛ نئی اُداسی اُسے تھکائے رکھتی، جیسے ایک طویل سفر طے کر کے آئی ہو۔ یہ اُداسی اپنے ساتھ ایک طرح کی لاتعلقی بھی لائی جس کی وجہ سے وہ اپنے اردگرد سے کٹ گئی اور ایک غمی کا احساس اُسے گھیرے رہتا۔ جب وہ اِس دور میں سے گزر رہی تھی تو ایک پریشانی اُس کی سوچ پر دستک دینے لگی اور وہ جانتی تھی کہ پریشانی کے ساتھ ہمیشہ خوف بھی منسلک ہوتا ہے۔ وہ خوف زدہ رہنے لگی اور اِسی خوف میں گھری رابعہ کا ایک دِن کلرک عباس کی موت سے سامنا ہو گیا۔ گھر میں کلرک عباس کی اولاد اور کچھ رشتے داروں نے پڑاؤ ڈال لیا۔ وہ سب اُسے کسی نہ کسی طرح مطمئن نظر آئے، جیسے یہ ایک دِن ہونا ہی تھا۔ سب کچھ روز وہاں ہی رہے۔ چند کمروں کے گھر میں وہ اپنے کمرے میں ہی سوتی تھی اور یہ سوچتی رہتی کہ اُن کے جانے کے بعد وہ زندگی کو کس طرف لے کر جائے گی؟ کلرک عباس کا

چھوٹا بیٹا، جو عمر میں اُس سے بڑا تھا اور ہر وقت اُس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا، ایک رات، جب وہ سوئی ہوئی تھی، اُس کے بستر میں گھس گیا۔ یہ کہا نہیں جا سکتا کہ وہ اُسے پسند آگئی تھی یا وہ اپنے مرحوم باپ سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ وہ گھبرا گئی اور اُسی گھبراہٹ میں اُسے بستر سے نہ تو باہر دھکیل سکی اور نہ ہی شور کیا، بس ایک بے نام سی مدافعت کے بعد ہتھیار ڈال گئی۔ وہ اگلی رات بھی آیا، تب وہ اُس کی منتظر تھی۔ رابعہ کو دونوں راتوں میں پہلی مرتبہ ایسی گہری نیند آئی جس کو وہ بھول چکی تھی۔ اُس بیٹے نے اپنے بہن اور بھائیوں کو قائل کر لیا کہ رابعہ کی شادی اُس کے سسر کے ساتھ کر دینی چاہیے۔ سسر بیوی کی وفات کے بعد تنہائی کا شکار تھا اور شادی کے بعد رابعہ کا اکلاپا بھی جاتا رہے گا۔ اب وہ اُس اچھی پکی ہوئی سبزی کی طرح بن گئی تھی جو پڑوسیوں کے گھروں میں چکھنے کے لیے بھیجی جاتی ہے۔ رابعہ کو اِس رشتے میں اپنے لیے ایک سہولت بھی نظر آئی: کلرک عباس کے بیٹے کا بوڑھا سسر تو اُس کے کسی کام کا نہیں ہونا تھا لیکن وہ اُس کے لیے ایک ڈھال تو ہو گا جب کہ وہ اُس کے داماد کے ساتھ اپنی نامکمل خواہشوں کو تکمیل دیتی رہے گی۔ شادی کے بعد وہ ایسا کر نہ سکی۔ بوڑھا سسر اُس کے گھر میں ہی منتقل ہو گیا۔ وہ اپنی زندگی سے مطمئن تو نہیں تھی لیکن اُسے سہارنے والا کوئی تھا بھی نہیں؛ والدین فوت ہو چکے تھے اور اُس نے زندگی تو گزارنی تھی۔ شادی کے بعد ایک دِن کلرک عباس کا چھوٹا بیٹا اپنے رشتے کی تجدید کے لیے آیا تو رابعہ کے بے رنگ ہو چکے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ رات کو جب وہ اُس کے بستر میں گھسا تو رابعہ کو پتا ہی نہ چلا۔ اُس نے اتنی سخت مدافعت کی کہ وہ خود بھی حیران رہ گئی، اُس نے شور مچانے کی بھی دھمکی دی۔ کلرک عباس کا بیٹا کچھ خوف اور کچھ رشتوں کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اُس سے پرے ہو گیا۔

وہ ایک بار پھر، دوراتوں کی بہار کے بعد، خشک اور کانٹوں والے جنگل میں داخل ہو گئی۔ وہ اُسی طرح زندگی گزار رہی تھی جیسے کلرک عباس کے ساتھ زندہ تھی۔ وہ بے خواہش تو تھی لیکن دوراتیں اُس کے اندر زندہ تھیں۔ وہ اپنی محرومی اور تکمیل کی خواہش کے درمیان میں ایسے گم تھی کہ اُسے اُداسی اور غمی کے بوجھ نے دبا لیا۔ وہ پہلے پریشان ہوئی اور پھر خوف زدہ ہو گئی۔ کیا اُس کا یہ بوڑھا خاوند بھی مرنے جا رہا تھا؟ اگر وہ مر گیا تو کیا کوئی اُس کے ساتھ شادی کرے گا؟ وہ تو موت کا ہرکارہ تھی؛ اب ہر کوئی اُس سے دور بھاگے گا۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے بوڑھے کی لمبی عمر کی دعا مانگتی لیکن وہ اپنے پر طاری پریشانی، خوف، اُداسی اور غمی کو دور نہ کر سکی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اُس نے خود سے سمجھوتا کر لیا اور بوڑھے کی موت کا انتظار کرنے لگی۔

بوڑھا گھر کے ایک کونے میں چارپائی پر اپنے مخصوص آسن میں بیٹھا اپنی ہی دنیا میں گم تھا اور رابعہ کو اُسے اُس گمشدگی کی حالت میں دیکھ کے حیرت ہوتی کہ وہ عنقریب فوت ہونے والا ہے جب کہ اُسے اپنے فوت ہو جانے کے بارے میں علم ہی نہیں تھا۔ وہ کسی طرح اُسے بتانا چاہتی تھی جو اتنا مشکل تھا کہ اُسے ممکن نہ لگا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کسی کو اُس کی موت کی پیش گوئی کرنا مناسب بھی نہیں۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں پریشان تھی؛ وہ جانتی تھی کہ اُس کے فوت ہوتے ہی اُس کے داماد نے ایک بار پھر اُس کے ساتھ ہم بستری کی کوشش کرنی ہے۔ کیا وہ اِس بار ہتھیار ڈال دے گی؟ شاید وہ ہتھیار نہ ہی ڈالے! گو وہ محرومی سے سمجھوتا کر

چکی تھی لیکن یہ جنگ کب تک لڑی جا سکتی تھی؟ دور ہونے کے باوجود وہ خاوند سے مزید دور رہنے لگی، وہ خواہش کرنے لگی کہ بوڑھا جلد از جلد فوت ہو جائے۔ یہ بھی چاہتی تھی کہ وہ لمبی عمر پائے۔ وہ ایک ایسا سہارا تھا جسے کھونا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کلرک عباس کے فوت ہونے کے بعد وہ اُس کے گھر والوں کے رحم و کرم پر آ گئی تھی جنھوں نے اُسے سنبھال لیا تھا لیکن اب وہ نہ تو اُن کے رحم و کرم پر تھی اور نہ ہی اُن کی ذمے داری۔ اب تو اُس کے سسرال وہ لوگ تھے جنھیں وہ جانتی تک نہیں تھی۔ کلرک عباس کے چھوٹے بیٹے کی بیوی کا کیا رویہ ہو گا؟ وہ اپنے باپ کی بیوہ کو خاندان کا حصہ قبول کر لے گی؟ کیا کلرک عباس کی اولاد اُسے اہمیت دے گی؟ وہ تو اب اُس کے خاندان کا حصہ نہیں رہی تھی۔ چھوٹے بیٹے کی کوشش سے وہ اُنھی کے گھر میں ٹکی ہوئی تھی۔ وہ اپنی اُلجھنوں میں الجھے جاتی تھی اور کسی نتیجے پر پہنچے بغیر مزید اُلجھنوں کا شکار ہوئے جاتی تھی۔ وہ یہ بھی سوچتی کہ اُس کے پاس کوئی حل تھا بھی نہیں اور یہ بھی جانتی تھی اُلجھن تبھی ختم ہوتی ہے جب اُسے حل کیا جائے۔

وہ سارا دِن صحن میں چکر کاٹتی رہتی اور انہی چکروں میں اُس نے گلی میں دیکھا، وہ گلی میں دیکھنے سے ہمیشہ کتراتی تھی۔ اُسے اپنے بوڑھے خاوند کے شک کا خدشہ رہتا کیوں کہ وہ جانتی تھی ایسے خاوند، جو کسی کام کے نہیں ہوتے، بے حد شکی مزاج ہوتے ہیں۔ اُسے گلی میں سے گزرنے یا دیکھنے والوں کا بھی خوف رہتا کہ وہ کیا سوچیں گے کہ بوڑھا گھر کے اندر بیٹھا ہے اور یہ باہر جھانکتی اور کسی کو تاڑتی ہے؟ رابعہ نے پنی اُلجھنوں میں الجھے ہوئے، صحن کے چکر کاٹتے کاٹتے باہر گلی میں دیکھا تو اُسے یقین نہ آیا۔ وہ چکرا گئی۔ اُس نے جو دیکھا اُس کو یقین بنانے کے لیے اُس نے صحن کا ایک چکر لگا کے گلی میں پھر جھانکا تو اُسے یقین آیا کہ جو اُس نے دیکھا وہ ویسے ہی تھا۔ گھر کے سامنے کے دو گھروں کے درمیان میں ایک خالی جگہ تھی جہاں کبھی چھوٹا سا گھر ہوا کرتا تھا۔ اُس خالی جگہ میں جہاں اب آس پاس والے گھر اپنا کوڑا پھینکتے تھے، وہاں شبیر کھڑا تھا۔ وہ بالکل اُسی طرح کھڑا تھا جیسے کبھی اُس کے انتظار میں ہوتا۔ کیا وہ جانتا تھا کہ رابعہ یہاں رہتی ہے؟ کیا اُس کا وہاں کھڑے ہونا محض اتفاق تھا؟ اگر وہ جانتا تھا کہ وہ یہاں رہتی ہے تو وہ کب سے یہاں کھڑا ہو رہا ہے؟ اُسے خود پر غصہ بھی آیا کہ وہ گلی میں باہر دیکھنے سے ویسے ہی خائف رہتی رہی اور سودے سلف کے لیے بوڑھے کو کیوں بھیجتی آئی تھی؟ وہ اچانک پریشان ہو گئی اور پریشانی کے ساتھ خوف زدہ بھی۔ اگر وہ اُس کے لیے وہاں کھڑا ہوتا ہے تو لوگ کیا سوچتے ہوں گے؟ اگلے ہی خیال نے اُس کی ہمت بندھائی کہ شبیر کا وہاں کھڑے ہونا اتنا معیوب نہیں تھا، جتنا کلرک عباس کے سوگ میں ہونے کے باوجود اُس کے بیٹے کے ساتھ دو راتیں بسر کرنا۔

رابعہ نے ایک بار پھر گلی میں دیکھا۔ اب وہ پر اعتماد تھی۔ اُسے زندگی میں ایک طویل عرصے کے بعد پہلی بار خوشی محسوس ہوئی۔ شبیر کو دیکھ کے اُسے لگا کہ وہ مانوس فضاؤں میں ہے۔ شبیر ایسے ہی کھڑا ہوتا تھا اور وہ کسی قدر شرماتے ہوئے، اِتراتے ہوئے اور اعتماد کرتے ہوئے، پاس سے گزرا کرتی تھی۔ اتنے سال وہ کہاں رہا تھا؟ اُس کے بیوی بچے ضرور ہوں گے؟ اُسے اپنے اندر ایک گھٹن سی ہوئی اور اُس نے لمبی سانس لی۔ شاید اُس کے بیوی بچے نہ ہی ہوں؟ اُسے اپنا آپ سکون سے محسوس ہوا۔ وہ اپنے خیالوں

سے نکلی؛اُس نے شبیر کی طرف دیکھا،وہ اُسے دیکھ رہا تھا۔اُسے شبیر کی نظر بالکل خالی لگی،اُس جگہ کی طرح جہاں وہ کھڑا تھا۔رابعہ نے سوچا کہ وہ شبیر کے متعلق کچھ نہیں جانتی اور شبیر اگر وہاں کھڑا تھا تو اُسے رابعہ کے متعلق سب کچھ معلوم ہو گا۔اُسے اگر شبیر کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا لیکن وہ تو اُس کے متعلق جانتا ہو گا کہ وہ ابھی تک گردش میں ہے۔وہ اپنے خاوند کی متوقع موت کی پیشگی اطلاع کسی طرح جان چکی تھی اور اُس کی موت کے بعد اُس نے اُس کے رشتہ داروں کے رحم و کرم پر ہونا تھا۔اُس نے پھر شبیر کی طرف دیکھا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔جواب میں وہ بھی اپنائیت سے مسکرائی۔اُس نے اُسی مسکراہٹ کے ختم ہونے سے پہلے شبیر کو اندر آنے کا اشارہ کیا!

پسلی

ڈاکٹر مجاہد عباس
لیکچرار شعبہ اردو، نمل، اسلام آباد

''پسلی'' کابستہ اندر باہر سے دوات کی سیاہی کے سبب اس کے دل کی طرح داغ دار تھا۔ پلاسٹک کی ایک پرانی دوائیوں والی شیشی میں چند پرانی لیریں، چند قطرے نلکے یا نالے کا پانی اور ایک سیاہ پڑیا ڈال کر اس نے دوات بنانے کی ترکیب اپنے ہم جولیوں سے سیکھ لی تھی۔ شیشی کا ڈھکن ٹوٹا ہوا تھا جسے اس نے ایک لیر کی مدد سے مضبوطی سے باندھ رکھا تھا مگر اکثر اوقات دوات کے سیاہ قطرے اس کے قاعدے، تختی اور بستے میں رچ بس جاتے تھے۔ اس کا قلم کانے کا تھا جس کی نوک پر دوات جم کر کسی پھوڑے کے کھرنڈ جیسی ہو چکی تھی۔ وہ سکول کے احاطے میں داخل ہونے سے پہلے ایک لمحے کے لیے رکتا اور پھر دانت بھینچتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ وہ جب تختی پر الف ب ج لکھتا تو اس سے ایک حرف بھی سیدھا نہ لکھا جاتا۔ لکھتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ کو اپنے ذہن کے تابع کرنے کی کوشش میں یوں محو ہو جاتا کہ اسے خبر ہی نہیں رہتی تھی اور اس کے بدن کی تختی ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ استاد کی آواز اسے چونکا دیتی اور وہ کچھ دیر کے لیے سیدھا ہو جاتا اور اگلا حرف لکھتے ہوئے پھر اس کا سر ڈھلک جاتا، آنکھیں ترچھی دکھائی دیتیں اور وہ بہتی ناک کو الٹی آستین سے اپنی ہی دھن میں رگڑتا رہتا تھا۔

سکول سے گھر تک پہنچتے ہوئے اسے کئی دشوار راستوں سے گزرنا پڑتا۔ ایک ایک کر کے اس کے ہم مکتب راستے میں چھوٹتے جاتے اور وہ اکیلا رہ جاتا۔ ویسے بھی وہ سب کے ساتھ گھلتا ملتا نہیں تھا کیونکہ اکثر لڑکے اس کی جسمانی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے اور اس پر رعب جماتے تھے۔ وہ کچے پکے راستوں، سرکنڈے کے جھاڑوں اور کوندروں سے ننگے پیروں کھسکتا ہوا جھونپڑی نما گھر میں داخل ہوتا جہاں اس کے چار بہن بھائی، اپنے اپنے ٹوٹے دانتوں سے خشک نوالے توڑ رہے ہوتے۔ وہ بھی بستہ ایک طرف پھینک کر اس چھینا جھپٹی سے اپنے جینے کا سامان کرتا تھا۔ اگرچہ اس کا سرمایہ کل بھی سب بہن بھائیوں کی طرح وہی ناطاقتی تھی تاہم اس کا بہن بھائیوں میں سے بڑا ہونا اس کے لیے غنیمت تھا۔ ابھی آخری نوالہ اس کے منہ میں ہوتا کہ اسکی ماں کا حسبِ معمول طعنہ ''تو بھی باپ کی طرح مارا جائے گا'' اسے بیقرار کر دیتا اور وہ رونی صورت بنا کر پکی سڑک پر نکل جاتا جہاں سے کبھی چار آنے مل جاتے یا پھر لوحِ دل پر لہجوں کے داغ دھبے لگتے رہتے۔

سکول کے احاطے میں داخل ہونے سے پہلے وہ حسبِ معمول رکا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ آج استاد کے ساتھ ایک اور شخص بھی موجود ہے جو قطار میں بیٹھے بچوں کا معائنہ کر رہا ہے۔ اسے بھی استاد نے قطار کے آخر میں بیٹھ جانے کا اشارہ کر دیا۔ وہ شخص تمام بچوں کی حرکات و سکنات کا انتہائی غور سے مشاہدہ کر رہا تھا، سکول کے بچے اس شخص کو غذا کا ڈاکٹر بتا رہے تھے جب کہ

اسے اس شخص کے ہاتھ میں کوئی کھانے کی چیز نہیں دکھ رہی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے کئی بار استاد کی میز پر، دیوار کے ساتھ پڑے بنچ اور اس شخص کی کرسی کے نیچے نظریں دوڑائی تھی۔ بعض بچے اسے نفسیات کا ڈاکٹر سمجھ کر اپنا موازنہ گلی میں گھومتے "دینوں" سے کر رہے تھے جس سے کسی قسم کی گالی کی توقع کی جاسکتی تھی یا وہ کسی کو بھی ایک ایسا ڈھیلا یا پتھر مار سکتا تھا جو جان لینے کے لیے کافی ہو جاتا۔ وہ شخص سب بچوں کو باری باری بلا کر ان کا معائنہ کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ تمام معلومات ایک سروے فارم میں درج کر رہا تھا۔ جب اسے بلایا گیا تو وہ ڈرتے ڈرتے اس شخص کے پاس گیا۔ اس نے فارم اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

آپ کا نام۔۔۔!

پسلی۔۔۔!

کیا۔۔۔!

کیا بتایا اپنا نام۔۔!

اپنا نام بتاتے ہوئے اس کا چہرہ شامِ غریباں کی طرح دھواں دھواں ہو گیا اور ایک نیلا کرب اس کے چہرے پر سے ہوتا ہوا اس کے وجود میں سرایت کر گیا۔

یہ کیسا نام ہے۔ وہ شخص حیران ہونے لگا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اس کا نام ''پسلی'' ہے آپ بے شک اس کی پسلیاں گن لیں نظر آتی ہیں سب۔ ہم سب بھی اس کو لٹا کر گنتے ہیں۔ ایک نو سالہ لڑکے نے ہنستے ہوئے کہا!

سب نے قہقہہ لگایا۔ وہ شخص بھی ہنسنے لگا۔

''پسلی'' کا دل اس بٹیرے کی طرح پھڑک رہا تھا جو شکاری کے جال میں پھنس گیا ہو۔ اس شخص نے اسے لٹا کر اس کا معائنہ کیا اور ساتھ ساتھ فارم پر کرتا رہا۔

اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں پیلاہٹ نے گھر کر رکھا ہے حتیٰ کہ پپوٹوں پر بھی پیلے دھبے نمایاں ہیں، سر کا گھیر معیار سے کافی کم لیکن اس کے دھڑ کے مقابل بڑا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اس کے سر کی پیمائش کرتے ہوئے موازنہ کرنے کے لیے دوسرے بچوں کی طرف دیکھا جو اس تماشے پر دانت نکال رہے تھے۔ اس کے اکثر دانت جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے اور اب پتلی نوکدار کتھئی رنگ کی تیلیاں بن چکے تھے۔ اس کا چہرہ کسی قدیم مخطوطے کا بوسیدہ ورق محسوس ہو رہا تھا۔ اس شخص نے جب اس کے سینے اور پیٹ سے چیتھڑے ہٹائے تو اس کی پسلیوں کے پنجرے سے جیسے پرندہ اڑ چکا ہو۔ بچوں نے شور مچاتے ہوئے اس کی پسلیاں گننا شروع کر دی تھیں جو مکان کی چھت پر رکھی خالی کڑیوں کی طرح الگ الگ گنی جاسکتی تھیں۔ اس شخص نے اس کی پسلیوں پہ ہاتھ رکھا اور انہیں ایک ایک کر کے ٹٹولا۔ "پوری ہیں" وہ دوسرے بچوں کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے مخاطب ہوا۔ مٹی کے گارے

اور گھاس کے سبزے سے لبریز پیروں کو جن کی لکیریں مٹ چکی تھیں اور جن پر کانٹوں نے نقطہ دار گہری مہریں ثبت کر رکھی تھیں، اس نے دیکھنا ضروری نہیں سمجھا اور اسے اٹھ جانے کو کہا۔ یہ فارم اس کی پوری فائل میں الگ تھلگ تھا۔

رات نے اپنے پر پھیلائے اور قریہ قریہ قرنوں تک اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ بستی، راستے، فصلیں، افق تا افق سیاہی کے پہاڑ کے سائے میں مدت تک خاموش ہو چلے۔ وقت کی آندھی نے چہروں کے حلیے بگاڑ ڈالے اور بالوں کے رنگ بدل دیے۔ وقت کی اوٹ میں اس بستی کی زمینیں دونوں موسموں کی چوبیس فصلیں پکا چکی تھیں۔

جب صبح ہوئی تو بستی میں کہرام بپا تھا۔ بستی کے سردار کا سر زخمی تھا اور وہ خون میں لت پت موت کا بیتابی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس کا طرہِ ابیض سرخ ڈھال بن چکا تھا۔ تنفس اس کے نتھنوں میں خراٹے لے رہا تھا۔ بیٹے جائیداد کے کاغذات پر اس کے انگوٹھوں کے نشانات لگوا رہے تھے۔ قبضے کی تمام زمینیں اس کی اولاد میں برابر بٹ چکی تھیں۔

اسی دوران لوگ اس کے قاتل کو جکڑ کر ایک درخت کے ساتھ باندھ رہے تھے۔ اس کے سر اور منہ کو ایک بوری سے ڈھانپ دیا گیا تھا اور اس کی آنکھوں پر کس کر ایک پٹی باندھ دی گئی تھی۔ وہ لوگ پولیس کو اطلاع دے کر اس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ پولیس نے آتے ہی پھرتی سے اسے گرفتار کیا اور ساتھ لے گئی۔ محکمانہ کارروائی کے بعد پولیس نے اسے عدالت میں پیش کیا اور گواہان نے گواہی دے۔ عدالت میں مقدمے کے دوران، نفسیات کے ڈاکٹر کی رپورٹ بھی شامل کی گئی تھی جس میں لکھا تھا کہ سردار کا قاتل ''عسل خان'' ذہنی طور پر بالکل صحت مند ہے۔ عدالت نے کارروائی مکمل ہونے پر کچھ ہی دنوں میں مقدمے کا فیصلہ سنا دیا اور یہ الفاظ ایوانِ عدالت کی دیواروں سے ٹکرانے لگے۔

''تمام عدالتی کارروائی مکمل ہونے اور اس مقدمے کا ہر پہلو سے مفصل جائزہ لینے کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ عسل خان عرف ''پسلی'' کو سردار کے قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا دی جاتی ہے اور ہدایت کی جاتی ہے کہ اجالا ہونے سے پہلے پہلے اسے دار پر لٹکا دیا جائے۔''

اگلے دن اخبار میں خبر شائع ہوئی کہ سردار کے قاتل ''پسلی'' کو پھانسی دینے کے لیے اس کے پیروں سے بیس کلو گرام کا باٹ بھی باندھا گیا تھا۔

آزاد

سکندر عباسی

لوگ اسے مینٹل کیس کہہ کر بلاتے تھے۔، کیونکہ اس کا مزاج کسی سے بھی نہیں ملتا تھا۔ وہ بھیڑ میں بھی تنہا رہتا تھا۔ اس کی عادتیں عجیب تھیں۔ اس کی سوچ سماجی سانچے میں ڈھل نہیں پاتی تھی۔ اس کے خیالات بنا پروں کے پرواز رکھتے تھے۔ اس کا طرز حیات عام دنیا سے ہٹ کے تھا۔ دنیا سے باغی دماغ میں وہ انیک سوالوں کے انبار لیئے پھرتا تھا۔ اس کی سوچوں کے سمندر میں الجھے الجھے سوالات سیپیوں کی مانند چمکتے رہتے تھے جو اسے ہمہ وقت بے سکون رکھتے تھے۔ گھر والوں نے اس کا نام تو کچھ اور ہی رکھا تھا مگر وہ خود کو آزاد کہلواتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ آزاد کے نام سے بدنام تھا کیونکہ لوگ اس کا ذکر مضحکہ خیز انداز میں کرتے تھے۔

آزاد کو بے ترتیبی سے عشق تھا جسکو وہ اپنے لیئے آکسیجن گردانتا تھا۔ اس کو خوف تھا کہ اگر یہ بے ترتیبی اس کی زندگی سے بیدخل ہوئی تو اس کا کی سانسوں کی ڈور ٹوٹ جائیگی۔ اسی باعث آزاد کی حیات کا ہر ایک صفحہ بے ترتیب اور بکھرا ہوا تھا۔ اس کے خواب بلکل ایسے معصوم تھے جیسے پرندوں کے خواب ہوتے ہیں۔ وہ قید سے کتراتا تھا، غلامی سے اسے سخت نفرت تھی، پابندیاں اس کو پسند نہیں تھیں.

آزاد کبھی بھی استری کئے ہوئے کپڑے نہیں پہنتا تھا، شکن آلود کپڑے اسے زندگی کی علامت محسوس ہوتے تھے۔ وہ کبھی بالوں کو کنگھی نہیں کرتا تھا اس کے خشک اور بکھرے ہوئے بال اس کے خیالوں کی طرح ہر قید و بند آزاد تھے۔ جدید زمانے میں بھی اس کے پاس موبائیل فون نہیں تھا۔ وہ موبائیل کو خیالوں میں خلل ڈالنے والا آلہ تصور کرتا تھا۔ کہاں دن گذارا کہاں رات ہوئی کب کہاں کتنے دن رات گم رہتا اس کا خود اس کے پاس بھی حساب نہیں تھا۔ مگر اس کی ماں اس کے لئے ہر وقت اداس رہتی تھی۔ وہ اس سے اس کی اس بے ترتیب زندگی کی شکایت کرتی رہتی تھی۔ آزاد کو اپنی ماں سے بیحد محبت تھی مگر وہ اپنے مزاج کے سامنے اتنا مجبور تھا کہ ماں کی فکر انگیز ہر سوال کے جواب میں اس کے پیروں کا بوسہ لے کر ہاتھ باندھے کھڑا رہ جاتا۔ آزاد کے کمرے میں ہر چیز ایسے بکھری ہوئی رہتی جیسے زمیں پہ درختوں سے گرے ہوئے خزاں رسیدہ خشک پتے۔ آزاد کے ذہنی حالت سب کو مشکوک معلوم ہوتی تھی لیکن جب وہ بولتا تھا تو بڑے بڑے دانا اس کے سامنے دنگ رہ جاتے۔ آزاد جب چھوٹا تھا تب اس کی ذہنی حالت کو نارمل نہ سمجھتے ہوئے اس کے علاج کے لئے مختلف معالجوں سے رجوع کیا گیا مگر سب نے آزاد کو ہر بیماری سے محفوظ قرار دیا تھا۔

آزاد لوگوں سے اتنی بات نہیں کرتا تھا جتنا وہ خود سے مخاطب ہوتا تھا۔ رات اتنی اندھیری کیوں ہوا کرتی ہے؟ دن روشنی کی علامت کیوں ہے!؟ سورج رات کو طلوع کیوں نہیں ہوتا!؟ چاند دن کو کیوں نہیں چمکتا!؟ کانٹے جب گلوں کے ساتھ پلتے پنپتے ہیں

توان کی طرح خوشبودار کیوں نہیں ہوتے !؟ خاموشی میں بے تحاشا شور کیوں رہتا ہے اور آوازوں میں اتنی خاموشی کیوں ہوتی ہے کہ اپنی دڑکن تک کی آواز سنائی ی نہیں دیتی !؟ ہوائیں آسماں سے کونسا پیغام لاتی ہیں اور خزاؤں کی پیڑوں سے کونسی دشمنی ہے کہ وہ اس کے پتوں کو اس کی کوکھ سے الگ کر دیتی ہیں !؟ لہریں جب کناروں کو چوم کر واپس پلٹ کر سمندر کے سینے میں سما جاتی ہیں تو کناروں پہ کیا گذرتی ہے !؟

وہ ایک ایسا وجود تھا جس سے ہر ایک بیزار بیزار رہتا تھا۔ سب کے لئے وہ ایک ناقابل برداشت بندہ تھا۔ مگر کوئی تھا جو اس کو چاہتا تھا۔ اور وہ پروین تھی۔ اور پروین کی آزاد سے انسیت دیکھ کر آزاد کی ماں کو ایک امید ہو چلی تھی کہ اس کا بیٹا پروین کے پیار کی قوت سے جلد ہی ایک نارمل انسان بن جائے گا کیونکہ محبت وہ کچھ کر جانے کی طاقت رکھتی ہے ناممکن سا لگتا ہے۔ کیونکہ جہاں دماغ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں وہاں دل کا دریچہ کھلتا ہے اور ایک خوشگوار جھونکا نئی زندگی کی نوید بن کر آتا ہے۔ اگرچہ پروین آزاد کی توجہ حاصل کرنے میں اب تک کامیاب نہیں ہوئی تھی لیکن اس کو آزاد کی ماں کی سپورٹ ضرور حاصل تھی۔ آزاد گوکہ پروین کے ساتھ پیار سے پیش نہیں آتا تھا لیکن پروین نے امید کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ جب اس نے آزاد سے محبت کا اظہار کر کے زندگی ساتھ گذارنے کی بات کی تھی تب آزاد نے اس کو ایسی دلیلیں دیتے ہوئے انکار کیا تھا کہ محبت ایک خوشبو ہے، ایسی خوشبو جو ہر پھول کی مہک سے کئی ہزار گنا پیاری ہے اور خوشبو کو قید نہیں کیا جاتا جبکہ شادی ایک قید ہے پابندی ہے اس لئے وہ کبھی نہیں چاہے گا محبت کی خوشبو کو شادی نام کی شیشے میں قید کرے۔

لیکن پروین نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ آزاد کو ہی جیون ساتھی بنا کر اس کی بیترتیب زندگی کو ترتیب دے کے رہے گی۔ گوکہ آزاد انتہائی درجے کا ضدی واقع ہوا تھا مگر وہ اپنی ماں کی حکم عدولی کرنے والا نہ تھا۔ اسی لئے آزاد کی ماں کو پختہ یقیں تھا کہ وہ آزاد کو پروین سے شادی کے لئے ضرور رضامند کر لے گی۔

پروین کے اس فیصلے پہ اس کے گھر کا کوئی بھی فرد راضی نہیں تھا کہ وہ بہت بڑی بیوقوفی کر کے ایسے شخص کے ساتھ زندگی گذارنے جارہی ہے جو مکمل طور پہ ایک الجھا ہوا وجود تھا۔ اور یہ بلکل ایک خودکشی تھی جو پروین کرنے جارہی تھی. پروین سے شادی کے بعد بھی آزاد رتی برابر بھی نہیں بدلا۔ وہ شادی کے دوسرے دن ہی اپنے آزاد مزاج کے مطابق کسی کو کچھ بھی بتائے بنا کہیں چلا گیا۔

اس کے جانے بعد پروین نے دن رات ایک کر کے بڑی محنت اور محبت سے کمرے کی ایک ایک معمولی سے معمولی چیز کو بھی سلیقے ورترتیب سے سیٹ کر کے کمرہ مکمل طور نکھار دیا۔ آزاد کے سارے کپڑے استری کر کے الماری میں ٹانگ دیئے۔ اس نے آزاد کی ہر ایک چیز کو ترتیب اور تہذیب سے رکھا اور آزاد کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگی۔

چند دن بعد اچانک آزاد واپس آیا تو اس کی آنکھیں رت جگوں کے باعث لال تھیں۔ بال بکھرے ہوئے کپڑوں اور جوتوں کی حالت غیر تھی اور لبوں پہ گہری خاموشی۔

آزاد جب اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اتنی ترتیب دیکھ کر اس کو پہلی نظر میں یوں لگا جیسے وہ کسی اور کے کمرے میں آ گیا ہے۔ پروین نے آگے بڑھتے ہوئے اس کے گلے میں اپنی نرم بانھوں کا ہار ڈالا۔ اور بتایا کہ کیسے اس نے محبت سے اس کی ہر چیز کو سلیقے اور ترتیب سے رکھا ہے۔ اور اس کی زندگی میں اب کوئی سی بھی بے ترتیبی باقی نہیں رہی۔ آزاد اداس اور ویاکل آنکھوں سے کمرے کو دیکھنے لگا۔ پروین کے چھرے پہ اطمنان والی مسکراہٹ تھی۔ آزاد جیسے سکتے میں آ گیا تھا۔ اور پروین اس کے چھرے میں خوشی کے آثار تلاش کر رہی تھی جو اسے نظر ہی نہیں آ رہے تھے۔

ایک دم سے آزاد نے پورے کمرے میں بوکھلاہٹ سے ادہر ادہر دوڑنا شروع کیا۔ اور پورے کمرے کے اندر جنونی انداز میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ پروین پریشان ہو گئی اور اس نے آگے بڑھ کر اسے کو بازو سے پکڑا۔

`آزاد۔۔ آزاد۔۔ کیا ہوا ہے۔۔ تم کیا تلاش کر رہے ہو۔۔ مجھے بتاؤ میں تمھیں وہ چیز ڈھونڈ کر دیتی ہوں۔ تم آرام سے بیٹھو، میں نے تمہاری ہر چیز بڑی ترتیب سے رکھی ہے۔ مجھے بتاؤ تمھیں کیا چاہئے تم کیا ڈھونڈ رہے ہو۔!؟`

آزاد اس کو اداس، اور خالی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ اور پھر نیچے زمین پہ بیٹھ کر مخاطب ہوا۔

`تم ڈھونڈ کے دو گی مجھے۔!؟`

`ہاں آزاد میں ڈھونڈ کر دوں گی۔`

`گم ہی تم نے کی ہے تو تم کیسے ڈھونڈ کر دو گی۔!؟`

`نھیں آزاد میں نے تمہاری کوئی سی بھی چیز گم نھیں کی، تم سے جڑا ہوا ایک ایک تنکا تک میں نے سنبھال کر رکھا ہے۔ ترتیب سے رکھا ہے`۔ آزاد کی کھوئی کھوئی نظریں کمرے کا جائی زہ لینے لگتی ہیں۔

`پروین تم نے بے ترتیبی گم کر دی ہے۔۔۔ اب وہ میں کہاں تلاش کروں۔۔ اب سے ترتیب دی ئی ے ہوئی ے کمرے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔۔۔ پروین۔۔۔ پروین یہ تم نے کیا کر دیا۔۔!!!`

پروین اسے سمجھانے لگتی ہے۔

`آزاد تمھیں تو خوش ہونا چاہئے۔ یہ ترتیب کتنی دلکش ہے۔ سلیقے سے رکھی ہوئی ہر چیز کتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔ تم بیٹھو۔۔۔ آرام سے اوپر بیڈ پر بیٹھو میں تمھارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔`

پروین چائے بنانے چلی جاتی ہے۔

آزاد کی بیچینی بڑھنے لگتی ہے۔ سانسیں اکھڑنے لگتی ہیں۔ اس کے اندر کا آزاد پنچھی پنجرے سے باہر نکلنے کے لئے پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔ ترتیب دیا ہوا کمرہ اس کی سانسوں کا تسلسل توڑنے لگتا ہے۔ وہ اٹھ کھڑے ہونے کی کوشش کرتا ہے تاکہ کمرے کی ساری چیزیں پھر سے بکھیر کے اسے پہلے سے زیادہ بے ترتیب کر دے مگر اس سے پہلے ہی اس کی بیچین روح اس کے جسم سے آزاد ہو جاتی ہے اور وہ ساکن بت زمیں پہ پڑا رہ جاتا ہے۔

کوزہ گر۔۔۔اور شہر اوہام

عدنان ظفر

ریل کی پٹڑیوں کے پار مضافات میں گاؤں آباد تھا۔ ہر طرف ایک عجیب سی چیختی ہوئی خاموشی تھی۔ راستوں پہ ہر طرف کیچڑ، بارش کا پانی نہ جانے کب سے ٹھہرا ہوا تھا، اور اس گدلے پانی کے کناروں پر جمی ہوئی کائی ماحول کو اور زیاہ ہولناک بنا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے مینڈک تیزی سے پھدکتے ادھر سے ادھر جاتے اور ٹروں ٹروں کا راگ آلاپتے اس بے جان خاموشی کو چڑہا رہے تھے۔ فیروز ایک کوزہ گر تھا، جو اسی بستی میں ایک جھونپڑی میں محض ٹھنڈی مٹی کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہ تھا، اور اس نے برسوں سے کوزے بنانے چھوڑ دیے تھے۔ اس کی جھونپڑی میں اشیائے ضروریہ کی کمی اس حد تک تھی کہ جیسے فالج زدہ جسم میں حرکت کی کمی ہوتی ہے۔

پسِ پردہ۔۔۔۔۔۔آٹو گراف

اہلِ شہادت، اہلِ محسنین اور اہلِ جمال۔۔۔۔۔۔!

افسوس کہ کچھ باقی نا رہا،۔۔۔۔۔۔۔۔سوائے آٹو گراف البم۔۔۔!

قحط الرجال ارزاں،

مردم شماری عروج پکڑ گئی، مردم شناسی ناپید۔

لوحِ ایام پہ سفر ِ نصیب لکھ دیا گیا، مگر آوازِ دوست قحط الرجال کی مانند حرفِ شوق ٹھہری۔ آبِ گم کی تلاش کسی زر گذشت کے راہ کا نشان بن گئی اور شامِ شیر یاراں کے خیالوں کا مدفن بنی۔ لیکن آٹو گراف پانے کی خواہش ہنوذ جاویداں اور آٹو گراف البم ابھی خریدا ہی نہیں۔

اسے بچپن ہی سے مٹی سے لگاؤ تھا۔ وہ گِل ولا سے ایسے مجبور کوزے بنانا چاہتا تھا، جو نہ صرف حقیقت سے لبریز ہوں بلکہ ان میں انسانوں کی طرح کی وہ عادتیں بھی پائی جائیں جس سے سزا اور جزا کا مرتکب ہوا جاتا ہے۔ وہ اپنے سیال کوزوں کی جانب بڑھنا چاہتا تھا، جو اسے چیخ چیخ کر پکارتے تھے کہ اے ابنِ آدم! توں چراغ آفریدم (چراغ کا تخلیق کار) ہے، مگر کبھی تخلیق کے عمل سے گزری ، تخلیق شدہ مخلوق کی بے چینی سے واقف ہوا؟ وہ جو کوزے تم نے بنائے ہیں کیا خبر، ان کوزوں میں بپھرتی اور لرزتی ہوئی بے چینی اس احساس سے تجھے امر کر دے کہ جس خیال سے تو واقف ہے۔ مگر! تو بھی تو معاشی بے کسی کا جکڑا ہوا انسان ہی ہے۔ اچانک سے ایک صراحی دار گردن والے کوزے کی گہرائی سے گرج دار صدا بلند ہوئی۔ اے کوزہ گر! اے میرے محسن! اے میرے تخلیق کار، سن! ذرا غور سے سن! یہ جو میں ہوں، وہ تو ہے، اور جو تو ہے، وہی تو میں ہوں، ہاں وہی میں، جس کی باز گشت کہیں تیرے اندر کے نہاں خانوں میں بسی ہوئی تھی۔ کوزہ گر چونک کر اپنی ساری تخلیقات پہ نظر دوڑاتا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر، بوسیدہ سے آدمی کا مجسمہ

،خود سے ہم کلام ہو کر یہ کہتا ہے، کہ بڑے بڑے محلات میں رہنے والے مفلس ذہن کے بوسیدہ لوگ، جن پر زندگی اپنی ساری خوبصورتیوں اور رعنایوں کے ساتھ ظہور پذیر ہوتی ہے، جن کی خاطر وقت دوڑتا بھی ہے اور رک بھی جاتا ہے۔ وہ۔۔۔۔!وہ لوگ ، مگر خالی۔۔ بوسیدہ اور ریت کا ڈھیر ہی تو ہیں۔ جیسے کہ میں۔

اچانک، پھر قرب وجوار سے موہنجوڈارو کے آثار والی تہذیب کی خاتون کا کوزہ گویا ہوا۔ ہوس کے پجاری، ابنِ آدم! بنتِ حوا کی عصمت کو ریزہ ریزہ تو کرتے ہیں، مگر زچگی کے نو ماہ کے اس قرب ناک دور کے کرب سے واقف نہیں۔ وہ دور بنتِ حوا کے لیے کربناک ہونے کے ساتھ ساتھ خوشی کا لبادہ اوڑھے محورِ قصاں ہوتا ہے، کہ پھر کسی مائی کے ہاں لال ہونے والا ہے! اور یہی مائی کا لال پھر کسی مائی کا دامن اور ستر دونوں لال کرنے سے نہ کترائے گا، چاہے وہ کسی سڑک کے کنارے ملے، ہسپتال کے بستر پر، یا پھر سکول، کالج، یونیورسٹی میں یا پھر گلی میں کھیلتی ہوئی کسی بچی کی صورت۔ شمال مشرقی جہت میں موجود سرکار کے اداروں کا ایک کمال اور خوبصورت جہاں آباد تھا۔ وہاں سے ایک صدا بلند ہوتی ہے اور ایک دفتر کا کلرک اپنی کرسی پر بمعہ میز اور فائل کے، ہاتھ میں قلم لیے اپنے کام میں مشغول دکھائی دے رہا ہے۔ یقیناً اس فائل کے نیچے مائع معیشت کے پہیے نہ لگے ہوتے تو نہ ہاتھ میں قلم ہوتا اور نہ ہی یہ موصوف مشغولِ عمل دکھائی دیتے۔ البتہ ساتھ والی میز پہ بیٹھے ایک اور صاحب سگریٹ کے کش کے ساتھ چائے کے سپ لے رہے ہیں۔ ادھر دور ہسپتال میں ایمرجنسی وارڈ کے حاضر سروس باریش ڈاکٹر صاحب رات کی ڈیوٹی پہ اپنے فرائض سر انجام دے رہے ہیں، کمرے کو کھلا چھوڑا ہوا ہے اور کرسی پر براجمان ہیں اور ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہیں، اور مریض قطار اندر قطار منتظر ہیں کہ قبلہ طبیبِ وقت کی کب اپنی نیند میں خلل محسوس نہ فرمائیں اور مریضِ حالات کا معائنہ فرمائیں۔ اجی معائنہ کاہے فرماویں گے قبلہ، بس حکمِ مجاوری صادر کرتے ہیں کہ شام میں میرے نجی کلینک آنا باقی علاج وہیں ہو گا۔

کوزہ گر ایک باکمال فنکار اور ماہر کوزہ گر تھا، کہ حضرت نے جیسے پورے شہر کا ہی نقشہ کھینچ دیا اور زندگی کے تمام شعبہ ہائے جات کو اس ایک مصنوعی انسانوں کے شہر میں سمو دیا۔ ایک طرف، شہر کی عالی شان کالج کی عمارت میں ایک پروفیسر صاحب، ماشااللہ سے جن کی توند حسبِ توفیق باہر تھی، اپنے ایک کولیگ سے لجائی ہوئی نظر اور صورت سے درخواست گو تھے کہ یار آج میرا لیکچر ذرا آپ لے لیں۔ ان سے استفسار کیا کہ ارے بھئی، کیوں بھیا؟ کاہے؟ تو قبلہ یوں بے ساختہ فرمانے لگے کہ یار شام کو اکیڈمی میں لیکچر دینا ہے، وہ لیکچر تیار کر لوں! یہ سن کر دوسرے پروفیسر صاحب دم بخود ہو گئے اور پتھر ہو گئے۔ بعد ازاں نظر دوڑائی تو کسی کونے میں حضرتِ انجینیر بھی اپنے کام میں مشغول تھے، اور اپنے ماتحت کو بتا رہے تھے کہ کون سا میٹریل استعمال کرنا ہے اور کون سا نہیں ۔عمارت کی تعمیر میں جس جس کونے سے وہ مال کھدیڑ سکتے تھے، ان تمام کونوں کو انھوں نے کھدیڑا۔

یہ سارا ماحول اس شہر کا ان پڑھ طبقہ بھی دیکھ رہا تھا۔ کوزہ گر نے مختلف بازار بھی ترتیب دیے تھے۔ ان بازاروں میں سب کچھ تو تھا سوائے خلوص کے ، ہر چیز ملاوٹ شدہ، ہر چیز میں ڈنڈی، ہر چیز میں ناجائز منافع خوری کا فن، ناقص ، غیر معیاری اور زائد المعیاد چیزوں کی بھرمار۔ گویا اس شہر کو نہ پڑھے لکھے طبقے نے سنبھالا، نہ ان پڑھ نے، نہ ہنر مند نے نہ ہی کسی نابغہ روزگار نے۔ چوک میں بیٹھے ایک بزرگ کا مجسمہ یہ ساری کارگزاری اپنے گرد جمع مجمعے کو سنا رہے تھے۔ ان کی شخصیت پر اثر تھی، چہرے پہ وجاہت اور پاکیزگی کے ساتھ نور ٹپکتا تھا۔ ان کے پاس بیٹھے مجمع میں موجود بے روزگاروں کے ساتھ ساتھ مثالی لوگوں کا کٹھ تھا جو ایک مثالی معاشرے کی بنیاد رکھنے پر مصر تھے۔ ارسطو کو اپنے استاد افلاطون کی محبت بھی سچ بولنے سے نہ روک سکی، ہر وہ انسان جو ڈر کی حد سے آگے نکل کر سوچ رہا تھا، وہی آگے جا رہا تھا۔ مگر موجودہ دور کے انسان میں وہ سکت نہیں۔

اس لیے کوزہ گر نے وہ کوزے بنائے، جو ہیں تو اس معاشرے کے باشندے اور اس معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ مگر وہ سرمایہ دارانہ نظام کے گرویدہ ہیں۔ اس شہر کے سارے مجسموں کے رویوں کو مجسمہ ساز نے بہت خوبصورت پیرائے میں مجسمہ سازی کے عجائب گھر میں پیش کیا۔ سب لوگ اپنی اپنی سوچ میں ڈوبے ہیں اور اگر رویے ایسے ہوں کہ سب، نفسی، نفسی کا ورد کرنے والے اس کھوکھلے شہر میں سب دوسروں کے مسائل پہ ہنستے ہوئے کبھی یہ نہیں سوچ سکتے کہ ہوا جب چلتی ہے تو آشیانے کسی کے نہیں بچتے ۔ مجسمہ ساز نے انسانوں کو سبق دینے کے لیے ایک چھوٹا سا شہر جانوروں کا بھی بسایا اور اس میں ایک گھر میں موجود ایک چھوٹے سے خاندان کے جانوروں کی کہانی دکھائی ہے۔ اس خاندان میں ایک میاں اور ایک بیوی رہتے ہیں۔ بیوی اپنے میاں سے لڑ کر کہہ رہی ہے کہ آج میں نے گھر میں ایک چوہا دیکھا ہے تو آپ ایک کڑکی خرید لائیں تاکہ اس چوہے سے نجات پائی جائے۔ چنانچہ میاں اگلے دن کڑکی لے آتا ہے۔ اس گھر میں میاں بیوی کے علاوہ ایک عدد بکری، مرغی اور کبوتر بھی رہتے تھے، جن میں قبضہ مافیا چوہا بھی گھس آیا تھا۔ چوہے کو جب پتہ چلا کہ صاحبِ خانہ ایک کڑکی گھر میں لائے ہیں تو وہ باری باری بکری، مرغی اور کبوتر کے پاس جاتا ہے، اور یہ کارستانی سناتا ہے کہ گھر میں کڑکی آگئی ہے تو بچ کے رہنا، مگر تینوں تمسخر سے اسے مذاق کا نشانہ بنا دیتے ہیں کہ یہ ہمارا مسئلہ نہیں تمھارا مسئلہ ہے۔ چوہا شرمندہ ہو کر واپس چلا گیا۔ ایک دن کڑکی میں سانپ پھنس گیا اور خاتونِ خانہ نے بغیر دیکھے کڑکی کو اٹھانا چاہا کیونکہ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس میں سانپ پھنسا ہے چوہا نہیں، چنانچہ سانپ نے اسے ڈس لیا۔

طبیب کو لایا گیا تو طبیب نے دوا کے ساتھ رائے دی کہ کبوتر کی ہڈی کو پیس کر دوائی بنا کر زخم پر لگائی جائے تو افاقہ ہو گا، سو سب سے پہلے کبوتر کی بلی دی گئی، طبیب نے یہ بھی کہا تھا کہ مزید طبعیت خراب ہونے پر مرغی کی یخنی پلائی جائے، لہذا مرغی کو بھی زبح کر دیا گیا۔ مگر خاتونِ خانہ کی طبعیت نہ سنبھل سکی اور وہ چل بسیں۔ لہذا رسمِ قل خانی کے لیے بکری کو بھی زبح کرنا پڑ گیا۔ اب مرغی، کبوتر اور بکری تو نہ رہے البتہ چوہا ویسے ہی دندناتا پھر رہا تھا۔ لیکن اگر وہ شاید چوہے کی بات کو سمجھ جاتے اور اس کی دور اندیشی کو

خاطر میں لاتے تو شاید حالات کچھ اور ہوتے۔ کوزرہ گر نے اس کہانی کو اپنے مجبور کوزوں کی مدد سے دکھایا اور انسانوں کا پیغام دیا۔ اب یہ ان کی مرضی جو مجسموں کے رویوں سے سمجھیں یا پھر قربانی دے کر۔۔۔۔البتہ۔۔۔۔۔

فیروز، فیروز، سلمٰی نے دبی ہوئی آواز میں فیروز کو پکارنا چاہا۔ مگر فیروز اپنی بے بسی کا تماشا بنا چپکے سے روتا ہوا مٹی کے ڈھیر کی مانند پڑا رہا۔ ادھر سے ریل گاڑی کی گونجتی ہوئی صدا، پٹڑیوں کی لرزاہٹ اور پرندوں کی چہچہاہٹ نے ماحول کو اور زیادہ ڈراؤنا بنا دیا۔ سلمٰی بالآخر اس کی جھونپڑی میں گھس جاتی ہے اور فیروز کو جھنجھوڑ کر اٹھاتی ہے۔۔۔۔۔مگر۔۔۔۔فیروز اپنے مجبور کوزوں کی طرح مٹی کے ڈھیر کی مانند ٹھنڈا ہوا پڑا تھا اور درد کے فاصلے مختصر کر چکا تھا۔

زرد آدمی کی سیاہ کہانی

شاکر انور

ہر کوئی اسے مردہ سمجھتا تھا، حالاں کہ وہ مردہ نہیں تھا۔ مردہ ہونے کے لیے مرنا ضروری ہوتا ہے جیسے رات کہنے کیلئے رات کا ہونا، مسکرانے کیلئے خوشی اور رونے کیلئے آنسو کا ہونا۔ وہ تو زندہ تھا مگر زندوں میں مردے جیسا زندہ۔ خواہشات جذبات سے یکسر عاری۔ بس صرف دھڑکنوں کو گنتا ہوا ایک انسان، زرد چہرے والا، آں کھیں غار کے اندر بجھتی ٹمٹماتی ہوئی، لمبا قد آور بڑے سر والا آدمی، وہ اب چالیس سال کا ہو گیا تھا، اسے خود حیرت ہوتی کہ وہ چالیس کا کیسے ہو گیا اسے تو بچپن میں ہی مر جانا تھا کسی نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ یہ مشکل سے دس سال۔ تک زندہ رہیگا اسکے کان بہت چھوٹے ہیں دس سال بعد وہ ہر روز مر جاتا یا خود کو مرتا محسوس کرتا مگر وہ زندہ رہا۔ دس سال بعد وہ دس سال اور بھی زندہ رہا۔ اب وہ بیس سال کا ہو گیا اور زندہ رہا، پھر بیس سال مزید اور اب وہ چالیس سال کا ہو گیا۔ اور زندہ رہا۔ ہر رات سونے سے پہلے وہ اپنے کان چھو کر دیکھتا مگر وہ بڑے نہیں ہوئے۔ اسے نہ جانے کیوں یقین تھا جس دن اسکے کان بڑے ہونگے وہ اسکی زندگی کا آخری دن ہو گا وہ اپنی زندگی کو بس بلاوجہ کھینچ رہا تھا بلکہ زندگی اسے کھینچ رہی تھی۔ اسے بہت ساری باتیں ناگوار لگتی تھیں،۔ اسے اسکول جانا پسند نہیں تھا وہاں ماسٹر بد روتھے جو اس کو کن بچا کہکر چھیڑتے اور بلاوجہ اس کے کان کھینچتے اور اسکی پٹائی کرتے اسکی پٹائی کی کوئی وجہ نہیں ہوتی لیکن پھر بھی وہ کرتے۔ ایک دن غصے میں آکر اس نے بورڈ پر ماسٹر بدرو کی جگہ بدروح لکھ دیا۔ اس نے انکے گھر اور اسکول کی۔ دیواروں پر بھی ماسٹر بدروح لکھ دیا تھا جو اسکی بھرپور پٹائی کی وجہ بنی تھی پھر اس نے اسکول چھوڑ دیا اور دلبر داشتہ ہو کر، اپنا گاوں ہمیشہ کیلئے خیر باد کر کے کراچی آگیا اسے۔ یہ شہر عجیب سا لگا۔ لوگ بھوکوں کو کھانا بھی کھلاتے اور چند پیسوں کے عوض بے دردی سے گولی بھی مارتے۔ اسنے ایک پرنٹنگ پریس میں کام شروع کر دیا۔ وہ ایک معمولی آدمی تھا۔ معمولی سے بھی زیادہ معمولی آدمی۔ جسکی خود اپنی نظروں میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اسکا کوئی دوست۔ نہیں تھا۔ اسکی شخصیت میں کبھی کوئی بات نہیں رہی۔ وہ گرمی بلکل پسند نہیں کرتا جیسے بہت سارے لوگ پسند نہیں کرتے۔ وہ اندھیرے اور سمندر سے ڈرتا جیسے بہت سارے لوگ ڈرتے ہیں اور کچھ نہیں بھی ڈرتے۔ اسے نیپال کو نیپال کہنا اچھا لگتا لیکن کلکتہ کو کولکتہ کہنا برا لگتا۔ اسے اس بات کی حیرت ہوتی کہ کوے اور فلپائنی ایک دوسرے کو کیسے پہچان لیتے ہیں وہ ہمیشہ اکیلا رہتا۔ وہ صبح سیر کرنے جانا چاہتا مگر کبھی جا نہیں سکا جیسے بہت سارے لوگ نہیں جاتے مگر کچھ لوگ چلے بھی جاتے ہیں۔ اس نے کبھی نہیں سوچا کہ تتلی اتنی خوبصورت کیوں ہوتی ہے، اور پھولوں میں رنگ اور خوشبو کہاں سے آتی ہے، سمندر میں موجیں کیوں پیدا ہوتی ہیں اور چاندنی میں گاؤں کیوں خوبصورت لگتا ہے۔

اسنے پہلی بار اپنے دل میں اپنی خالہ زاد بہن طاہرہ کیلئے محبت جیسی چیز محسوس کی۔ وہ اس سے شادی کا بھی خواہش مند ہوا مگر اسکے خالو نے اسکے چھوٹے کان کی وجہ سے انکار کر دیا اسے اس انکار پر زیادہ افسوس نہیں ہوا۔ اسے افسوس ہوا اور بس۔ پھر طاہرہ کی

شادی ہو گئی کچھ دنوں بعد اسکے شوہر کا انتقال ہو گیا حالانکہ اسکے کان بڑے تھے۔ وہ اکثر طاہرہ کو یاد کرتا طاہرہ سے زیادہ اسکے آنسو وں کو جو اس نے اس دن بہائے تھے جب ماسٹر بدروح نے اسکی پٹائی کی تھی۔ وہ بہت رویا تھا اور وہ بھی بہت روئی۔ پھر وہ چپ ہو گیا مگر وہ روتی رہی۔ وہ پھر رونے لگا تھا۔

اسے ہیجڑوں سے ہمیشہ خوف آتا۔ اسے بہت ساری چیزوں سے خوف آتا جیسے بہت سارے لوگوں کو بہت ساری چیزوں سے اتا مگر کچھ لوگوں کو نہیں بھی اتا۔ وہ رات کے اندھیرے کے آخری پہر میں چمگادڑ کے پھڑ پھڑانے سے نہیں ڈرتا اور کتوں کے بھونکنے سے بھی نہیں لیکن وہ سردیوں میں نہانے سے ڈرتا اور کالی بلی سے بھی ڈرتا۔ اسے کویٹہ عنابی ہوٹل کی کڑک چائے پسند تھی۔ اسے غصہ بہت کم آتا اور جب آتا تو جاتا نہیں اور جب جاتا تو پھر چلا جاتا۔ وہ اپنی بے بسی اور کمزوری کو اندر ہی اندر چھپا کر غصے کو پالتا رہتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے اسکے جسم میں کوئی انگارہ دہک رہا ہو کبھی تیز کبھی مدھم۔ وہ بہت ساری باتیں نہیں جانتا جیسے بہت سارے لوگ نہیں جانتے۔ اسے نہیں معلوم کہ اکسپریسو کافی کا موجد کون ہے اور مزہ کیسا ہوتا ہے۔ اس نے کافی کا نام سنا تھا اور بس ۔ وہ اپنے کام میں ماہر تھا پر نٹنگ کے دونوں مشینوں پر مہارت سے وہ کام کرتا۔ اسکا سیٹھ اکثر خوش ہو کر اسے گالی دیتا اور بر گر کھلاتا اور وہ ساری گالیاں مسجد کے نکڑ پر بیٹھے دایاں ہاتھ کٹے فقیر ہر الٹ دیتا

بھنچ۔۔۔ کام کیوں نہیں کرنا سالا ہٹا کٹا ہڈ حرام وہ۔ اسے ایک روپیہ اور ایک گالی دیتا اور آگے بڑھ جاتا۔ وہ کام کے بعد کویٹہ عنابی ہوٹل سے دودھ پتی چائے پی کر گھر جاتا۔ راٹ کو سونے سے پہلے چمگادڑ کے پھڑ پھڑانے اور کتوں کے بھونکنے کا انتظار کرتا پھر پھڑ پھڑانے اور بھونکنے کی آواز کے بعد وہ سو جاتا۔

آج اسے تنخواہ کے ساتھ سیٹھ نے بونس بھی دیا۔ وہ۔ بہت خوش تھا۔ اسے اچانک ہی ایک انجانی سی خوشی کا احساس ہوا۔ کیوں اور کیسے ،اسے نہیں معلوم۔ اس نے لٹن پان والے کی دکان سے ایک میٹھا پان منہ میں دبا کر ایک سگریٹ سلگائی اور بس اسٹینڈ کی طرف بڑھا۔ اچانک رینجر کے آفس سے قبل ایک جہاز اس کے اوپر سے گزرا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو سر پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ڈر گیا۔ وہ ہمیشہ جہاز سے ڈرتا۔ اسے نہیں معلوم کہ جہاز کا موجد رایٹ برادرز تھا یا کوئی اور۔ اسے تو بس جہاز سے ڈر لگتا جیسے بہت سارے لوگوں کو لگتا ہے اور کچھ لوگوں کو نہیں بھی۔ اسٹاپ سے پہلے دو موٹر سائیکل سواروں نے اسے روکا موبائل اور پیسے نکال۔ اسکے کنپٹی پر پستول تھا۔ تو کہتا تھا کہ ہڈ حرام کام کیوں نہیں کرتا ہے۔ اج سے کام شروع کر دیا۔ دو میں سے دوسرا وہی دایاں ہاتھ کٹا فقیر تھا جسے وہ ایک روپیہ اور ایک گالی دیتا تھا موبائل نہیں ہے۔ وہ بولا

جھوٹ بولتا ہے بھڑوے، ایک زوردار مکا اس کے منہ پر لگا اسے بھی غصہ آ گیا لیکن وہ کمزور زرد انسان بے بسی میں کچھ نہیں کر سکا بس اسکے منہ پر پان کی پیک پھینک دیا بس وہ اتنا ہی کر سکتا تھا جو آس کے بس میں تھا۔ دوسرے ہی لمحے گولی چلی اور وہ زمین پر گر پڑا۔ وہ اپنی جیب کو پوری طاقت سے پکڑے تڑپتا رہا کچھ دیر بعد ہی وہ مر گیا۔ اسکے مرنے پر کوئی نہیں رویا۔ کون روتا، کوئی۔ رونے

والا نہیں تھا. کچھ لوگوں کے مرنے پر کوئی نہیں روتا، کچھ روتے بھی ہیں کچھ نہیں بھی جو روتے ہیں وہ بھی کچھ دنوں بعد مر جائے ہیں اور جو نہیں وہ بھی. اس نے اپنی جیب کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا مردے کی گرفت کا اندازہ صرف مردہ نہلانے والا ہی لگا سکتا ہے۔۔۔بڑی مشکلوں سے اسے الگ کیا گیا۔ جیب سے پیسے کی بجائے صرف ایک خط نکلا

پیاری طاہرہ۔ اج میں بہت خوش ہوں لیکن اس خوشی نے مجھ کو خوفزدہ کر دیا ہے۔ میرے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ خوشی راس نہیں آتی۔ مجھے سیٹھ نے تنخواہ کے ساتھ بونس بھی دیا ہے۔ میرے پاس اب اتنے پیسے ہو گئے کہ بہ آسانی تم کو رخصت کرا سکتا ہوں۔ پیسے سیٹھ کے پاس جمع کر دیا ہے۔ اگلے ماہ میں رخصتی کرانے آرہا ہوں میرا انتظار کرنا تمہارے ساتھ محبت اور چاہت کے لمحات گزار کر مجھے نئی زندگی مل جائے گی مجھے یقین ہے ۔میں زندہ رہنا چاہتا ہوں تمہارے لیے تمہارے نام کے ساتھ۔ ۔۔۔۔۔۔تم میرا ساتھ دو گی نا

آگے خون کے داغ سے الفاظ مٹ گئے تھے۔

غزلیں

غزل---فرحت شکور(پاکپتن)

مت پوچھ کہ ہم کیسی بلاؤں میں گھرے ہیں
خوابوں سے جو نکلے تو صداؤں میں گھرے ہیں

بے یارو مدد گار تیرے چاہنے والے
صحراؤں کی جاں سوز ہواؤں میں گھرے ہیں

جینے کا ہمیں حق ہے نہ مرنے کی اجازت
ہم اہلِ وفا کیسی سزاؤں میں گھرے ہیں

آنکھوں میں کوئی خواب نہ دل میں کوئی خواہش
ہم زیست کی بے رنگ خلاؤں میں گھرے ہیں

سینچا ہے لہو دے کے سدا لالہ و گل کو
کیوں اہلِ چمن پھر بھی خزاؤں میں گھرے ہیں

حسرت ، کبھی نفرت ، کبھی غربت ہمیں بخشی
ہم لوگ مقدر کی عطاؤں میں گھرے ہیں

افلاس و فلاکت کی چلی آندھیاں ہر سو
کیوں اہلِ وطن اتنی وباؤں میں گھرے ہیں

اے میرے خدا کیوں یہ میرے دیس کے باسی
ڈر خوف کی محبوس فضاؤں میں گھرے ہیں

سچ ، سوچ ، قدم اور قلم محدود ہیں اپنے
ہم اہلِ سخن ایسے خداؤں میں گھرے ہیں

ہوتے ہی نہیں پست کبھی حوصلے میرے
شاید کسی اپنے کی دُعاؤں میں گھرے ہیں

لوٹے نہ میرے صاحب اس شہر فسوں جا کر
کسی دلرُبا کی دلکش اداؤں میں گھرے ہیں

آیا نہ خیال ان کو میری صحرا گری کا
کس زُلفِ گرہ گیر کی چھاؤں میں گھرے ہیں

یکسر نہیں میرا ، تو رقیبوں کو مبارک
ہم اہلِ طلب اب کہ اناؤں میں گھرے ہیں

کیا پوچھتے ہو حالِ دلِ زار ہمارا
اک یار بے وفا کی جفاؤں میں گھرے ہیں

کس موڑ پہ لے آیا یہ عشق ہمیں فرحتؔ
دُکھ درد کی گھنگھور گھٹاؤں میں گھرے ہیں

☆☆☆

غزل۔۔۔۔۔۔اجمل اعجاز

بنا بولے ہوئے گفتار کرنا
اسے کہتے ہیں آنکھیں چار کرنا

سکوں دیتا ہے روٹھے کو منانا
منا کر پھر اسی کو پیار کرنا

جگایا ہے کسی غفلت زدہ کو
غلط ہے کیوں اسے ہر بار کرنا

کیا مفلس مری دریا دلی نے
مجھے آتا نہیں انکار کرنا

جہاں پاؤں رکھو، روشن زمیں ہو دئے روشن یونہی دلدار کرنا
تری باتیں رلائیں خوں کے آنسو زباں کو اور کیا تلوار کرنا
محبت کا صلہ اجرت نہیں ہے مری جاں، ہے یہ کاروبار کرنا

☆☆☆

غزل۔۔۔الیاس بابر اعوان، نمل یونیورسٹی اسلام آباد

-

وہی ہوا کہ تماشا لگانا پڑ گیا ناں تمھیں بھی دکھ کو صحافت بنانا پڑ گیا ناں
بڑا تھا شوق تمھیں سیدھی رہ دکھانے کا تمام شہر مخالف بنانا پڑ گیا ناں
سمجھ میں آیا کہ ہم لوگ چیختے کیوں تھے تمھیں بھی خوف رجسٹر کرانا پڑ گیا ناں
جو لوگ دوستی کو بزدلی سمجھتے تھے اب امن کے لیے جرگہ بٹھانا پڑ گیا ناں
ستارا وار ابھرنے لگا ہوں آنکھوں سے دیے کی لو کو بڑھانا گھٹانا پڑ گیا ناں
یہ لوگ موت سے کم پر تو خوش نہیں ہوتے سو زندہ رہنے کو مر کر دکھانا پڑ گیا ناں

☆☆☆

غزل---ثمینہ سید

کل کے سکھ تو گروی رکھے, پچھلے بوجھ اتارے اندر اندر سلگوں لیکن نکلوں زلف سنوارے
جانتی ہوں میں تیز ہوا ہے راہ میں رستہ روکے کون ہے ,خوشبو کے لہجے میں جا کر اسے پکارے
ایسے لگتا ہے میں خود ہی اس پہ جھولنا چاہوں مجھ کو درد کی سولی سے اب آ کے کون اتارے
اسی لیے تو نیند کی دیوی سے میں چھپنا چاہوں روز مری آنکھوں سے کوئی آگ سے خواب گزارے
دیکھ دیکھ کے ان کو حوصلہ ملتا تو ہے مجھ کو میری طرح سے جاگتے ہیں یہ شب بھر چاند ستارے
ایک اداسی کے دھاگے میں خود ہی بندھتی جاؤں میری سوچوں پر یہ کون ہے خوف کے چھینٹے مارے
درد کے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں معلوم نہیں میری غزلیں, میری نظمیں, میرے نغمے سارے

☆☆☆

غزل۔۔۔ قاضی اعجاز محور

خاک ہوں آسماں پہ پہنچا دے عشق کا عین مجھ کو پڑھا دے
میں مرا ہوں تری محبت میں دل کے آنگن میں مجھ کو دفنا دے
پیار تو ایک عام سی شے ہے اپنی نفرت کا مجھ کو تحفہ دے
بن کے جگنو مجھے دکھا رستہ اور رستے سے مجھ کو بھٹکا دے
میں تجھے دیکھ کر غزل لکھوں ایک بوسے کا طرحی مصرعہ دے

☆☆☆

غزل۔۔۔ انعام کبیر، لیکچرار اردو

شگفتگی کی ریاضت کو لاکھوں سال ہوئے یوں ارتقا ہوا اور پھول اس کے گال ہوئے
یہ مہر و ماہ، شب و روز، کائنات کے رنگ بہم ہوئے تو کہیں تیرے خدّ و خال ہوئے
گلاب ٹوٹ کے جُوڑے میں سج گئے لیکن ہم ایک شاخ سے ٹوٹے تو پائمال ہوئے
اکیلے روتے تھے دل میں گزشتگان کے زخم ترے بچھڑتے ہی رونق ہوئی نہال ہوئے
عجیب مخمصے میں پڑ گیا وہ شخص الٹا مرے جواب بھی اک سطح پر سوال ہوئے
ہمیں وہ چاند سا چہرہ نظر نہیں آیا ہمارے روزے تو پورے کا پورا سال ہوئے

☆☆☆

غزل۔۔۔ محمد ایوب صابر

بجھ گیا ہے دل سے شعلہ عظمتِ پرواز کا پڑ گیا ہے ماند جذبہ عظمتِ پرواز کا

بے پروں کے جھنڈ دیکھے ہیں زمیں پر رینگتے سن رہے ہیں صرف قصہ عظمتِ پرواز کا
صورتِ شاہیں کرے تسخیر جو دلکش فضا اس کے سر پر باندھ سہرا عظمتِ پرواز کا
وہ پرندہ شوق سے اڑتا پھرے شام و سحر پی لیا ہے جس نے دریا عظمتِ پرواز کا
عمر بھر اس نے تھکن سے واسطہ رکھا نہیں چکھ لیا تھا جس نے خوشہ عظمتِ پرواز کا
آسماں کی سمت اڑنے میں مری توقیر ہے مل گیا ہے مجھ کو زینہ عظمتِ پرواز کا
جو قفس میں زندہ رہنے کے لئے تیار ہیں پڑھ رہے ہیں مل کے نوحہ عظمتِ پرواز کا
ہمتِ پرواز میرے خوں میں ہے محوِ سفر سوچ میں باقی ہے نقشہ عظمتِ پرواز کا
سربلندی کی طرف صابر اسے مائل کرو پوچھتا ہے جو بھی رتبہ عظمتِ پرواز کا

☆☆☆

غزل۔۔۔رانا عامر لیاقت، اسسٹنٹ کمشنر گجرات

ہو بھی جائے, تو بھی اکثر, نہیں ہوتا کوئی اپنی اوقات سے باہر نہیں ہوتا کوئی
ایک انسان ہی انسان کا دکھ سمجھے گا سخت ہو سکتا ہے، پتھر نہیں ہوتا کوئی
اعتبار آئے گا تم پر مگر آتے آتے اک ملاقات میں ازبر نہیں ہوتا کوئی
جن شرائط پہ ترے ساتھ چلے جاتا ہوں! دیکھ ۔۔۔!! اس طرح میَسر نہیں ہوتا کوئی
بعض اوقات تو میں خود سے بھی ڈر جاتا ہوں اکثر اوقات مجھے ڈر نہیں ہوتا کوئی

☆☆☆

غزل۔۔۔ مبشر سعید، رجسٹرار یونیورسٹی آف ساہیوال

کوئی ملتا ہی نہیں سوختہ پا میری طرح جس کو معلوم ہو وحشت کا پتا میری طرح
میرے جیون کو اُداسی سے ملانے والا! دشت میں پھرتا رہے آبلہ پا میری طرح
میں نے احباب کو آواز لگا کر پوچھا کوئی رہتا ہے شبِ غم میں سدا، میری طرح؟

اے کئی دن سے مرے ذہن پہ چھائے ہوئے شخص
تو مجھے وصل کے سپنے نہ دکھا میری طرح

رات بھر چاند کو احوال سنانے کے لیے
کیا ٹھہرتی ہے دریچوں میں ہوا، میری طرح؟

زندگی! میری طرف دیکھ کے ایماں سے بتا
ایک بھی شخص کوئی تجھ کو مِلا، میری طرح

تند اور تیز ہواؤں کے علاقے میں سعید
زیست کرتا ہے فقط دل کا دِیا میری طرح

☆☆☆

غزل---ڈاکٹر انور علی انور

جنگ میں قائل رہا ہوں کب میں تیغ و تیر کا
مانتا ہوں پھر بھی انور رول میں شمشیر کا

اک زمانے سے رہا ہوں بر سر پیکار میں
یہ قلم بھی اک حوالہ ہے میری توقیر کا

برف باری کا یہ موسم درد کی تصویر ہے
اور میں مارا ہوا ہوں درد کی تصویر کا

میں نے اپنا دل جلایا ہے تمھارے واسطے
اور تم نے طوق پہنایا مجھے رہ گیر کا

قتل کرکے وہ مجھے یاروں سے یہ کہتا رہا
کیا خطا میری ہے اس میں کھیل ہے تقدیر کا

میری چاہت کا محل مسمار ہوتا ہی رہا
آگرا سر پر میرے ملبہ میری تعمیر کا

جس نے میرا راستہ روکا ہے انور کیا کہوں
اک سرا میں نے بھی تھاما ہے اسی زنجیر کا

☆☆☆

غزل---ناصر ملک

شبہ بچھڑنے کا ہونے نہیں دیا اُس نے
ستم کیا ہے کہ رونے نہیں دیا اُس نے

نہیں ہے خواب کوئی بھی تھکن سے لپٹا ہوا
میں کہہ رہا ہوں کہ سونے نہیں دیا اُس نے

وہ ایک زخم مرے شوق کی نشانی تھا
وہ ایک زخم جو دھونے نہیں دیا اُس نے

نہیں یہ کم تو نہیں ہے کہ مدتوں مجھ کو
ہجومِ وقت میں کھونے نہیں دیا اُس نے

یہ میرے اشک بجھا دیں گے آگ اندر کی
اُسے پتہ تھا جو رونے نہیں دیا اُس نے

☆☆☆

غزل۔۔۔ڈاکٹر الیاس عاجز

مری آہ و فُغاں سُن کر خفا دربار ہیں مُجھ پر
یہ لکھتے اُن کی جانب سے کئی اخبار ہیں مُجھ پر

مَیں باغی ہوں مگر پہلے بغاوت کا سبب جانو
وگرنہ ہتھکنڈے اوچھے سبھی بے کار ہیں مجھ پر

اِدھر بے زار ہوں مَیں حاشیہ بردار ٹولے سے
اُدھر ظِلِّ اِلٰہی بھی بڑے قہار ہیں مُجھ پر

اگر حکمِ اطاعت ہے تو پھر یہ یاد رکھ لینا
حُسینی ہوں کئی واجب ابھی انکار ہیں مجھ پر

سُبُک سر لوگ بستی کے مرا اب خوں بہائیں گے
کہ کھینچے شش جہَت سے تیر اور تلوار ہیں مجھ پر

اسیری میں حُرِیَّت کی فضا میں خود بناؤں گا
فلک تک پھر اُٹھائے جو دَر و دیوار ہیں مُجھ پر

مَیں بیعت کر تو سکتا ہوں مگر پھر جھوٹ پر مبنی
قصیدے شاہ کے لکھنا بڑے دُشوار ہیں مجھ پر

مرے لفظوں میں رنج و غم سمٹ آتا ہے اُمَّت کا
کہ ماضی حال و مستقبل سبھی بیدار ہیں مجھ پر

نہ سمجھو کھیل لفظوں کا یہ دل کو چیر نکلے ہیں
وَرُودِ جسم و جاں عاجز جو بھی اشعار ہیں مجھ پر

☆☆☆

غزل---عنبرین خان

بتاؤ کون کہتا ہے، محبت بس کہانی ہے
محبت تو صحیفہ ہے، محبت آسمانی ہے

محبت کو خدارا تم ، کبھی بھی کھیل مت سمجھو
محبت معجزہ ہے معجزوں کی ترجمانی ہے

محبت پھول کی خوشبو، محبت رنگ تتلی کا
محبت پربتوں کی جھیل کا شفاف پانی ہے

محبت اک اشارہ ہے، وفا کا استعارہ ہے
محبت اک ستارہ ہے، فلک کی بیکرانی ہے

زمیں والے! بتاؤ کس طرح سمجھیں محبت کو
محبت تو زمیں پر آسمانوں کی نشانی ہے

محبت روشنی ہے، رنگ ہے، خوشبو ہے ، نغمہ ہے
محبت اڑتا پنچھی ہے، محبت بہتا پانی ہے

محبت ماؤں کا آنچل، محبت باپ کی شفقت
محبت رب کی رحمت کا جہاں میں نقش ثانی ہے

محبت ہے بہن کی اور ہے بھائی کی الفت بھی
محبت کھیلتا بچہ ہے اور چڑھتی جوانی ہے

محبت حق کا کلمہ ہے، محبت چاشنی من کی
محبت روح کا مرہم، دلوں کی حکمرانی ہے

محبت تو ازل سے ہے، محبت تا ابد ہوگی
محبت تو ہے آفاقی، زمانی نہ مکانی ہے

فنا ہو جائے گی دنیا، فنا ہو جائیں گے ہم تم
محبت باقی رہ جائے گی، یہ تو جاودانی ہے
محبت کا احاطہ اور کن الفاظ سے ہوگا
محبت تو محبت ہے، محبت زندگانی ہے

☆☆☆

نظمیں

مشینیں---نوید ملک

"سلیبس مکمل جو کروا سکیں ایسی نایاب رنگیں مشینیں
کہاں بِک رہی ہیں؟
وہ رنگیں مشینیں
جو ذہنوں میں کھلتے گلستاں کو بے رنگ کر دیں
جو "بستوں" میں ویرانی بھر دیں
جو خوابوں پہ ہر امتحاں کا نتیجہ بکھریں
تھکاوٹ انڈیلیں
مشینیں کہ جن سے
لبوں پر سرکتے سوالوں کو باندھیں
قلم سے ہمکتے خیالوں کو باندھیں
سحر کی جبیں سے چھلکتے اجالوں کو باندھیں
مشینیں کہ جن سے
اڑانیں کُترنے میں آسانیاں ہوں
نگاہیں کچلنے میں آسانیاں ہوں
تجسس نگلنے میں آسانیاں ہوں
کہاں ہیں؟
مشینیں!
جو آنکھوں کے پیڑوں پہ دولت کے آرے چلائیں
سرابوں، عذابوں کی "بٹ بٹ" سے کانوں کے جنگل
جلائیں
جو گوندھیں کئی جگنوؤں کو، کئی سورجوں کو
تمدن کے ملبے سے ڈھونڈیں خزائیں
دھڑکتے ہوئے عکس سارے بجھائیں
بصارت پہ دستک نہ کوئی اگائیں
"کلاسوں" میں قبریں سجائیں
جو یونانی مٹی سے تیار ہر ایک پیکر کو روندیں
کھلونے بنائیں
جو سُقراطی پنچھی بہت چہچہاتے ہیں ان کی
ہواؤں سے چہکار ساری مٹائیں
ابھرتی ہوئی جنبشوں پر غضب آندھیوں کا گرائیں
مشینیں!
جو بس نوکری کی مشینیں بنائیں
کہاں ہیں؟

☆☆☆

مجھے کتنی سہولت ہے۔۔۔ازہر ندیم

مجھے جب زندگی کے حسن کا ادراک کرنا ہو
مجھے کتنی سہولت ہے
مجھے جب آسماں کی وسعتوں سے بات کرنی ہو
میں ان پھیلی ہواؤں میں بس اک پیغام لکھتا ہوں
مجھے پھولوں ستاروں سے کوئی منظر سجانا ہو
میں ان خالی فضاؤں میں تمہارا نام لکھتا ہوں
مجھے خوشبو سے مہکے موسموں کو گھر بلانا ہو
مجھے ہر سو جمالِ خواب کی برسات ملتی ہے
مجھے رنگوں کی دلکش وادیوں کی سیر کرنی ہو
تمہاری یاد سے مجھ کو، یہ کائی نات ملتی ہے
مجھے آواز کے جادو میں جب بھی ڈوب جانا ہو
مجھے کتنی سہولت ہے

☆☆☆

نعمان سلیم کی انگریزی نظم کا ترجمہ۔۔۔عنبرین خان

شبِ تیرہ کی سیاہی کے چند خاموش،
سرمئی گہرائیاں ہم کو بلاتی ہیں
بے رنگ، دودھیا لمحوں میں
چلو آؤ!
خوابیدہ رہے ہم تم
کہ ہم بانہوں میں بانہیں ڈال کر
یہاں آؤ
آغاز کرتے ہیں، نئی اک بے کراں
گھڑی بھر کو
نیلی، بنفشی سی مسافت کا
تم اپنی سرخ ہتھیلی کو کھڑکی پر ٹکا کے
کہ ہر حد سے پرے
دھند کے اس پار،
ہم نور کی پرواز کرتے ہیں
افق سے بھی پرے دیکھو
کہ سارے خوف پیچھے اور نیچے چھوڑ کر
سنو!
ہم آسمانوں کے سمندر میں
سرگوشیاں چلتی ہواؤں کی
وسیع پہنائیوں میں پھر سے کھو جائیں
یہ موسم، جان و دل کے زخم بوسیدہ، پرانے سب،
شبِ تیرہ کی سیاہی میں امر ہو جائیں
ہرے کرنے کا موسم ہے
سو جائیں
وہ دیکھو!
دور اوپر آسماں کی وسعتوں میں